اصولِ
نعت گوئی
حلیم حاذق
Gov

حلیمؔ حاذق

نام کتاب	:	اصولِ نعت گوئی
نام مصنف	:	حلیم حاذق
صفحات	:	۱۸۴ (ایک سو چوراسی)
سنہ اشاعت	:	۲۰۰۹ء
تعداد اشاعت	:	۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت	:	۲۰۰/ روپے
حسب فرمائش	:	دلکش رانچوی، ہنر پلاموی، بسمل بھاگل پوری
ترتیب و تزئین	:	اسد اقبال
ناشر	:	حلیم حاذق
		۸۷/ فیل خانہ سکنڈ لین، ہوڑہ۔۱۔ مغربی بنگال۔
سرورق	:	عنبر شمیم
طباعت	:	ڈائمنڈ آرٹ پریس
		۱۳۷ اے، بینٹنک اسٹریٹ، کولکاتا

تقسیم کار

دستک کتاب گھر	51/16/ کاویز گھاٹ روڈ
	شیب پور ہوڑہ
ریڈرس اینڈ رائٹرس فورم	۸۷ پیلخانہ سکنڈ لین ہوڑہ
مژگاں پبلیکیشنز	توپسیا روڈ، کولکاتا

ہمارے معاونین و مخلصین اور احباب جن کی اعانت وتعاون سے یہ کتاب طباعت واشاعت کی منزل سے گزر کر قارئین کی خدمت میں پہنچی

اللہ تبارک وتعالیٰ بصدقۂ رسولِ اعظم ﷺ ان سب کی جائز مرادوں کو پوری فرمائے اور دارین کی سعادتوں سے شرف یاب فرمائے..... (آمین)

حلیم حاذق

فہرست

حرفِ انتساب

سادات ِخانوادۂ برکات مارہرۂ مقدّسہ کے نام

نذرِعقیدت

مجدّدِ اعظم امامِ عشق و محبت احمد رضا فاضلِ بریلوی،

فقیہہ اعظمِ ہند حضور صدر لشریعہ علامہ امجد علی اعظمی،

حضور مفتئی اعظمِ ہند علامہ مفتی مصطفٰے رضا نوری بریلوی

☆ ☆

نذرِ محبت

والدِ مکرّم حضرتِ حاذقؔ انصاری کے نام

حلیم حاذق

صاحب کتاب ایک مختصر تعارف

نام: محامد اصغر
قلمی نام: حلیم حاذق
والدین: محترمہ زمرد فاطمہ، محترم حاذق انصاری (علیہ الرحمہ)
ولادت: ۱۹۶۶ء
جائے پیدائش: فیل خانہ ہوڑہ۔ا۔ مغربی بنگال

تصنیفات وتالیفات:

(۱) مرکزِ نور : نعتوں کا مجموعہ ۱۹۸۵ء
(۲) فروغِ تجلّی : غیر مسلم شعراء کی نعتوں کا انتخاب ۱۹۸۸ء
(۳) انمول نعتیں : معروف شعراء کی نعتوں کا انتخاب ۱۹۸۹ء
(۴) زنداں بدوش : حضرت حاذق انصاری کا مجموعہ کلام ۲۰۰۰ء
(۵) مطلعِ انوار : حضرت حامی گورکھپوری کی نعتوں کا انتخاب ۲۰۰۱ء
(۶) لوحِ افکار : نعتوں کا مجموعہ ۲۰۰۱ء
(۷) آگہی گر نہیں : کلیم حاذق کے تنقیدی مقالات کا انتخاب ۲۰۰۳ء
(۸) ارمغانِ حبیب : طرحی نعتیہ مشاعرہ کا پچیس سالہ انتخاب ۲۰۰۵ء
(۹) اصولِ نعت گوئی : تحقیقی وتنقیدی مقالات ۲۰۰۹ء
(۱۰) معین الدین ماجد : شخصیت اور شاعری (مع انتخابِ کلام) ۲۰۰۹ء

منتظر اشاعت کتاب

(۱) حاذق انصاری فن اور شخصیت (۲) قیامت صغریٰ (داستان کربلا)

حرفِ آغاز

ایک مُدت سے میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ ایک کتاب فنِ نعت گوئی پر ترتیب دی جائے جس میں نعتیہ شاعری کے شرعی آداب واحکام کے ساتھ اس نازک صنف کی فکری وفنی مشکلات اور زبان وبیان کی نزاکتوں کو عام فہم انداز میں پیش کیا جائے۔ لیکن یہ مرحلہ اس قدر دشوار تھا کہ ایک طویل مدت تک بس سوچتا ہی رہا پھر چند بزرگوں اور احباب کی ہمت افزائیوں نے قوت بخشی اور یہ کام اپنی بساط کے اعتبار سے کسی حد تک کرنے میں کامیاب ہوا۔

میرے دل میں اس کام کی تحریک اس لئے پیدا ہوئی کہ آج ہمارے شعراء رسولِ رحمت ﷺ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے وقت بے شمار مسائل سے دوچار ہورہے ہیں جس کی کئی وجوہات ہیں۔

پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ ہماری جدید نسل مذہبی تعلیم وتربیت سے بہت حد تک آشنا نہیں جبکہ قدیم شعراء مذہبی تعلیمات سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں ایک پاکیزہ مذہبی ماحول ابتدا ہی سے ملا تھا۔ لہذا جب وہ نعت گوئی پر توجہ دیتے تھے تو ادبی ومذہبی سطح پر انکا ذوقِ سلیم رہنما ہوجاتا تھا اور نعت گوئی میں کامیابی نصیب ہوتی تھی۔ لیکن جیسے ہی زمانہ بدلا، قدریں تبدیل ہوئیں، نئے نئے خیالات ونظریات کی لہریں ابھریں۔ سماج وتہذیب میں بدلاؤ آیا ہماری جدید نسل کا ذہنی، مذہبی اور تہذیبی رشتہ کٹتا چلا گیا اور نئی نسل ظن وتخمین کی راہوں میں بھٹکنے لگی۔ اسے تشکیک وتذبذب کی سرخ آندھیاں نئی دنیا کا بے رنگ آئینہ دکھلا کر اپنے خود ساختہ نظاموں کی زنجیر میں اسیر کرنے لگیں۔ ایک زمانے سے اسلامی فکروشعور اور تہذیب وتمدن کے خلاف منظم تحریکیں بھی چلائی جاتی رہیں۔ ان تمام تحریکوں کے اثرات شعروادب پر بھی مرتب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کے ناقدین ومبصرین مسلط کردہ اثرات کی روشنی میں شعروادب کی تشریح وتفہیم کرنے لگے۔ اس طرح ادب کے ذریعہ اسلامی فکروشعور کی روشنی کا نئے اذہان تک پہنچنے کا سلسلہ موہوم ہوگیا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ اس بے شعوری تقلید نے جہاں گمراہیوں کے سیکڑوں دروازے کھولے وہیں مذہبی اسٹیج کا سہارا لے کر بعض مغرب زدہ ذہنیت رکھنے والے ایسے افراد بھی سامنے

آئے جو اسلام کے بنیادی عقائد و نظریات کی تشریح و تفسیر خود ساختہ مغربی نظریات کے تحت کرنے لگے۔ انھیں جدید نظامِ فکر کے نام پر یہود و نصاریٰ نے کمال ہوشیاری سے اپنا نمائندہ بنالیا اور انھیں خبر بھی نہ ہوسکی۔ اس طرح اسلامی ماحول میں گمراہ کن اثرات کے سائے پھیل گئے۔ جس کے نتیجے میں مختلف فرقوں کے نام سامنے آئے اور نام نہاد اصلاحی تحریکیں بھی سرگرمِ عمل ہوئیں جو کفر و شرک، بدعت و گمراہی اور حرام و ناجائز کے فتوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکیں حتیٰ کہ میلاد النبی، حیات النبی، معراج النبی، عقیدۂ عصمتِ انبیاء، اختیاراتِ رسالت، علمِ نبوّت، تعظیمِ رسالت، عقیدۂ ختمِ نبوت، تصرفاتِ اولیاء، اسطرح کے سیکڑوں مبرہن اور بنیادی عقائد کے خلاف بے دریغ کفر و شرک اور ضلالت و گمراہی کے فتوے صادر کئے گئے۔ جسکا علمائے اہل سنت نے پوری ایمانی حرارتوں کے ساتھ محاسبہ کیا اور اسلامی عقائد و نظریات کو قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح صورت میں پیش فرمایا۔

ظاہر ہے اس انتشار زدہ دور میں جہاں داخلی اور خارجی سطحوں پر فکر و نظر کی جنگ جاری ہو، مختلف فرقوں اور گروہوں کی دھما چوکڑی چل رہی ہو، سماجی و سیاسی سطح پر دشمنانِ اسلام کی سازشیں مسلمانوں کو کچلنے کے لئے ہمہ دم مصروف ہوں، اور مسلمان تعلیمی فقدان کی وجہ سے مذہبی امور سے غافل ہی نہیں بلکہ بے پرواہوں۔ اس ماحول میں اگر کوئی روشن بخت خوش عقیدہ مداحِ رسول اپنے جذبات و احساسات پیش کرنا چاہیگا تو اسے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اسکا اندازہ ہر باشعور شخص لگا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ صنف نعت پر کام کرنے والے محققین و ناقدین کی دشواریوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اربابِ علم و دانش کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دنیائے شعر و ادب میں نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ جس طرح نعت گوئی کا فن مشکل ترین ہے اسی طرح اس فن پر تبصرہ تجزیہ، تشریح و تفہیم اور تحقیق و تنقید بھی پُل صراط سے گزرنے کی طرح سخت تر مرحلہ ہے۔ عام فن پاروں میں ناقد اور فنکار آزادی کے ساتھ تحقیق و تنقید کرسکتا ہے۔ لیکن فن نعت گوئی کے سلسلے میں انھیں مختلف زاویوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ادبی تحقیق و تنقید ان کے لئے خاصا آسان ہوتی ہے مگر جب اسلامی فکر و نظر کی روشنی میں اور شرعی اصولوں کے اجالے میں کسی کلام کی درجہ بندی اور اس کے حسن و قبح کو واضح صورت میں پیش کرنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ تو انھیں دوہری ذمہ داری پوری کرنی

پڑتی ہے۔ یہاں ہر قدم پر عقیدہ اور عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا حد درجہ احتمال رہتا ہے۔ کیونکہ جس طرح نعت میں شاعر کا قلم ٹھوکر کھاتا ہے تو ثواب کے بجائے عذاب الٰہی کی زنجیر میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ناقد اور مبصر کا قلم اگر اس کی تشریح و تجزیہ میں غیر شرعی اصولوں اور عقائد اسلامی کے بر خلاف خامہ فرسائی کرتا ہے تو اسے بھی دردناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی لئے علمائے کرام وفقیہانِ دین متین نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر مذہبی امور میں کسی شخص سے کوئی شعوری یا لا شعوری طور پر خطا ولغزش ہو جائے تو بغیر انانیت اور نفسانی دباؤ کے فوراً اپنے قول سے رجوع کر لے۔ کیونکہ شرعی تقاضوں سے صرفِ نظر کرنا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔

مذکورہ کتاب کوئی باضابطہ تصنیف نہیں اور نہ یہ خالص تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے بلکہ نعتیہ شاعری سے متعلق چند ایسے مقالات ہیں جو اخبارات ورسائل کے لئے لکھے گئے تھے اسی کے ساتھ نعت گوئی کے سلسلے میں پیش آنے والے چند دشوار مقامات کی نشان دہی اختصار کے ساتھ ہے۔ جسے زبانی طور پر ترتیب دی گئی ہے اور چند فقہی تنقید سے متعلق مقالے بھی شامل کر دیے ہیں۔

چونکہ پیشِ نظر کتاب ادب کے ان طالب علموں کو سامنے رکھ کر ترتیب دی جارہی ہے جو نعتیہ شاعری وادب سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ اس لئے ایسے اشعار بطورِ مثال پیش کئے گئے ہیں جن میں شرعی وادبی نقائص نظر آئے۔ تاکہ حسن و قبح دونوں سامنے رہیں اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

مغربی بنگال کے حوالے سے نعتیہ شاعری سے متعلق یہ پہلی کاوش ہے اگر میں اپنی کوششوں میں کسی حد تک کامیاب ہوا تو اس کامیابی کو ہمارے بزرگوں اور احباب کی دعاؤں کا ثمرہ سمجھیں اور اگر ناکام ہوا تو اسے میری بے علمی وبے بضاعتی پر محمول کرتے ہوئے اس سے بہتر کتاب لکھنے کی ہمارے ہم عصر قلم کار کوشش فرمائیں خصوصاً علمائے کرام وفقہائے عظام سے التماس ہے کہ بنظرِ اصلاح اپنے نیک مشوروں سے سرفراز کریں تاکہ غلطیوں کی صحت مند اصلاح ہو جائے۔

پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں دعا گو ہوں مولائے قدیر اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے میں میری غلطیوں کو معاف فرمائے اور میری اس کاوش کو قبول فرما کر میرے آباء واجداد اور تمام مداحانِ رسول کے لئے ذریعۂ نجات اور توشۂ آخرت بنادے (آمین)

طالب دعا...... **حلیم حاذق**

صنفِ نعت......ایک تجزیاتی مطالعہ

نعت عربی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جس کا معنیٰ تعریف وتوصیف اور مدحت وستائش کے ہیں۔اس کی حرمت وعظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عربی شعروادب کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی کسی دوسری ذات یا شخصیت کی مدح سرائی کے لئے لفظِ نعت کے اصطلاحی معنیٰ ومفہوم کو اس کے مخصوص نظامِ فکر کے تحت کبھی استعمال نہیں کیا گیا بلکہ نعت کی جگہ ہر خاص وعام کی مثبت تعریف مدحیہ اور قصیدہ ہی کی شکل میں کی گئی جو عہد رسالت سے قبل بھی عربی ادب میں ایک صنف سخن کی حیثیت سے رائج رہا۔لیکن جب توصیفِ رسالت کا تقدس مآب موضوع مطلعِ شعروادب پر جلوہ بار ہوا اور اسلامی فکرونظر سے جہالت پرست ادبی روایتوں کا براہِ راست ٹکراؤ ہوا تو اس عالم میں موضوعِ مدحیہ ایک مخصوص صنفِ سخن کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ایک ناقد نے صنفِ نعت کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نعت ابتدائی عربی شاعری میں ہر خاص وعام کی مثبت تعریف کے تحت ملتی ہے۔اوائل میں فارسی شعراء نے بھی رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہٴ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدحت نعت کی صورت میں کی ہے۔''میں یہاں نعت کی صرفی ،نحوی اور لغوی تحقیق سے بحث نہیں کروں گا بلکہ نعت کو ایک صنف ہونے کے پیشِ نظر چند باتیں عرض کروں گا

اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو بعض بنیادی سوالات خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں ۔پہلی بات یہ کہ نعتِ نبوی کا آغاز کس صنفِ سخن میں ہوا؟ اگر رسولِ اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف قصیدہ کی شکل میں کی گئی تو اسے نعت کا نام کیوں دیا گیا۔صرف قصیدہ ہی لکھ دینا کافی تھا۔دوسری بات یہ کہ جب نعت کی صورت ہی میں صحابہٴ کرام کی توصیف ہوجاتی تھی تو پھر منقبت کی ایک مخصوص صنف کیوں ایجاد کی گئی؟

تیسری بات یہ ہے کہ اس صورت میں نعت اور منقبت کا فرق ہی معدوم ہوتا نظر آتا ہے اور چوتھی بات یہ کہ جب ایک لفظ قصیدہ پہلے سے موجود تھا تو ہر خاص و عام کی مدح سرائی میں نعت کا لفظ کیسے نظر آ گیا۔؟

ظاہر ہے ان تمام باتوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر ساتھ ہی ادب کے ارتقائی سفر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے اردو ادب میں نعت کو ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم اور منفرد صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کیا۔ اگر اس نظریئے کے تحت مذکورہ بالا سوالات پر بحث کی جائے تو بعض باتیں بڑی اہم سامنے آئینگی۔ مثلاً نعت کے لغوی معنیٰ سے قطع نظر صرف اس لفظ کی ساخت پر غور کریں تو معلوم ہو جائیگا کہ حضور سرورِ کائنات کی تعریف و توصیف کے لئے اربابِ علم و فن نے بڑی نزاکتوں کے تحت اس لفظ کا انتخاب کیا یعنی (ن) کا حرف نبی آخر الزماں کی طرف اشارہ کرتا ہے دوسرا حرف (ع) عربی سرکار کی جانب اور تیسرا حرف (ت) تعریف و توصیف کا علامتی نشان بن جاتا ہے۔ دوسری بات موضوعاتی شکل میں نعت ہمیشہ سے ایک منفرد صنف رہی ہے جسکی تفصیل آگے قصیدہ اور نعت کے امتیازی فرق کے تحت بیان کی جائیگی اور تیسری بات منقبت اور نعت کے سلسلے میں ہے۔ دراصل ہمارے ناقدین ادب کو اس ضمن میں غلط فہمیوں کا شکار اس لئے ہونا پڑا کہ انھوں نے نعت کے عناصرِ ترکیبی پر فارغ نظری سے توجہ نہیں کی ورنہ عربی اور فارسی میں بصورتِ قصیدہ ہی انھیں نعت اور منقبت کا جداگانہ انداز ضرور نظر آتا۔

نعت میں منقبت کے جو اشعار نظر آتے ہیں اس کی نوعیت خاص منقبت کی ہرگز نہیں بلکہ وہ نعت کے فیضان کے مرکزی عناصر ہوتے ہیں جو مختلف صورتوں میں حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرتِ ابوبکر صدیق کی صداقت، حضرتِ عمر فاروق کی عدالت، حضرتِ عثمان غنی کی سخاوت، حضرتِ علی مرتضیٰ کی شجاعت، حضرتِ بلال کا جذبۂ عشق، حضرتِ اویس کا اضطراب اور دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی قدسی صفات و حیات کے روشن پہلوؤں کو رسولِ گرامی ﷺ کی نظر کیمیا اثر نے کس انداز سے نوازا اور پھر ان برگزیدہ نفوسِ

قدسیہ نے اپنی حیات وکائنات سے زیادہ حضور پاک ﷺ سے وفا کیشی وجاں نثاری کا ہر لمحہ ثبوت دیا تو اس کے نتیجے میں آقا کے ذکرِ جمیل کے ساتھ غلاموں کا ذکرِ خیر بھی ناگزیر ہو گیا۔ لیکن اب اس کا مقصد ہر گز یہ نہیں کہ نعت کی صورت میں منقبت نگاری ہوئی اس بات کو دوسرے انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ نعت اور منقبت کا نظامِ فکر اور حمد اور نعت کا دائرۂ فکر بہر حال ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لیکن بعض مقام پر جہاں ساختیاتی یکسانیت کی جھلک نظر آتی ہے اس کی نوعیت فیضان کی ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں حفظِ مراتب اور فرق وامتیاز کا مکمل لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے یعنی جو فرق حمد اور نعت میں خالق ومخلوق اور معبود وعبد میں ہے اسی طرح ایک خط امتیاز نعت اور منقبت کے تصور میں نبی اور امتی اور آقا اور غلام میں ہے اس طرح اصنافِ سخن کی شناخت یوں قائم ہوتی ہے مثلاً حمد میں خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیت والوہیت اور اس کی مدح وثنا ہوتی ہے۔ نعت میں حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف اور منقبت میں صحابۂ کرام وبزرگانِ دین کی مدح وستائش مخصوص افکار ونظریات اور خصوصیات وکمالات کے تحت بیان کی جاتی ہیں مگر یہ مدح وستائش کا انفرادی شعبہ ہے جہاں مختلف اصناف ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں لیکن یہاں ''صورتِ حال'' کا نازک ترین معاملہ ہے جس کی نوعیت وشناخت کے لئے میں نے ایک لفظ فیضان کا استعمال کیا ہے۔

اگر کسی کلام میں اس قسم کا تأثر نظر آئے تو اسلامی عقائد ونظریات اور حدودِ شریعت کی روشنی میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ کلام میں کس زاویہ سے کام لیا گیا ہے، مداح کا روئے سخن کس طرف ہے اور اس کی خالص نوعیت کیا ہے کیونکہ فیضان کا آفاقی ومعنوی نظام بڑا ہمہ گیر ہوتا ہے اس کی بے شمار جہتیں ہوتی ہیں مثلاً حمد پاک کا آفاقی تصوّر نور ہے تو اسی نور کی تخلیق نعت ہے اور نعت کا تصوّر ایک سورج کے مثل ہے اور منقبت کا نظامِ فکر ان ستاروں کی طرح ہے جو اپنی ذاتی روشنی سے نہیں چمکتے بلکہ سورج کی کرنوں سے ان کا وجود روشن ہو گیا ہے اب جو ستارہ جس قدر قریب ہو گا اتنا ہی تابندہ ودرخشندہ نظر آئے گا۔

اسی مرحلے کو ہمارے ناقدین نے کہہ دیا کہ عربی وفارسی میں نعت ہی کی صورت میں منقبت کہی گئی ہے جبکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ نعت کے مضامین قرآن وحدیث اور سیرت نبوی سے ماخوذ ہوتے ہیں اور منقبت صحابۂ کرام اور بزرگانِ دین کی شخصی سیرت اور کمالات وصفات سے عبارت ہے جہاں کسی ''صورت'' کا تصور ممکن نہیں اگر کلام میں منفرد تاثر کی جلوہ سامانی ہے تو اس طرح کی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں مگر تاثر کا ارتقائی سفر بصورت فیضان جب سامنے آتا ہے تو حمد سے نعت میں مظہر حق اور ظل رب کا عکسِ منور دیکھا جاتا ہے اور نعت سے منقبت میں جمال نبوی اور سیرتِ محمدی کا حسین پیکر وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کے جلوے لے کر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس ارتقائی تاثر نامہ میں توازن واعتدال قائم رکھنا سب کے بس کی بات نہیں لہذا الگ الگ اصناف سخن قائم کیے گئے تاکہ کفر وشرک سے انسان محفوظ رہ سکے۔

ممکن ہے کہ کائنات شعروادب میں اس نہج کی باتیں نعت کی ایک مخصوص ہیئت نہ ہونے کے سبب ہوتی ہوں شاید اسی وجہ سے بعض ناقدین نے نعت کو غیر صنفی ادب تک قرار دے دیا ہے اور اس کی ظاہری ساخت یا ہیئت سے متعلق کوئی ناقدانہ بحث بھی غیر ضروری تصور کیا گیا لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ صنف نعت ابتدائی زمانے سے ہمیشہ موضوعات کی سطح سے ایک مخصوص صنف شاعری کا اعلان کرتی رہی ہے اس کے بھی چند وجوہات ہیں چونکہ جب نعت گوئی کی بنیاد پڑی تو اس زمانے میں دیگر اصناف سخن کی طرح نعت کے لئے الگ سے کوئی فارم نہیں تھا اور آج تک نعت کسی مخصوص ہیئت ہی میں محدود نہیں ہے لیکن نعت گوئی کا ابتدائی دور بتاتا ہے کہ قصیدے کا فارم نعت گوئی کے لئے سب سے زیادہ مناسب تھا جو اس زمانے کا مقبولِ عام صنف سخن سمجھا جاتا تھا اور اسی کی پیروی شعراء نے کیا لیکن ایک عام قصیدے کے مقابل نعتیہ قصیدہ ایک ہیئت اور اسلوب میں ہونے کے باوجود مختلف بھی نظر آئیگا اسکی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ قصیدہ کے تمام لوازمات کو نعت کا تقدس مآب موضوع اور اسکی فضا برداشت نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ قصیدہ کے معنوی نظام میں افتراق وغلو اور بے سروپا خیالات وجذبات کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں

اور نعتیہ قصیدے کو اسلامی شریعت کی روشنی میں حق و صداقت احترام و تہذیب شائستہ خیالات وجذبات کے عناصر کو تمام افراط و تفریط سے دامن بچا کر پیش کیا جاتا ہے۔اس کی دو مثالیں اس موقع پر کافی ہیں جو بیک وقت ایک اعلیٰ درجے کا قصیدہ ہونے کے علاوہ نعت کی لازوال مثال بھی ہیں اور جنہیں بعد کے شعراء نے اپنے تفنن کلامی کے لئے خضر راہ بنایا ہے ان میں ایک قصیدہ صحابی رسول حضرت کعب بن زُہیر ؓ کا ہے جو قصیدہ بانت سعاد کہلاتا ہے اور دوسرا قصیدہ حضرت بوصیری علیہ الرحمہ کا ہے جو قصیدہ بردہ شریف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ان دونوں نعتیہ قصیدوں کی سب سے اہم خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ابتدا تشبیب سے ہوئی ہے جو زمانہ جاہلیت کے شعراء کا اصول خاص تھا۔قصیدۂ بانت سعد میں تشبیب کے بتیس ۳۲ اشعار ملتے ہیں اور قصیدۂ بردہ شریف میں تیرہ ۱۳ اشعار تشبیب کے نظر آتے ہیں۔اس کے بعد ایک سو سے زیادہ اشعار نعت رسول پر مشتمل ہیں۔حضرت حسان بن ثابت ؓ نے غیر مسلسل انداز میں جو نعت لکھی ہے وہ تشبیب سے خالی ہے چونکہ عربی شاعری کا اسلوبِ خاص یہ تھا کہ اگر قصیدہ ہے تو تشبیب کا ہونا لازمی ہے اور اگر غیر مسلسل اشعار ہیں تو ان میں تشبیب ضروری نہیں ہے حتیٰ کہ یہی تشبیب بعد میں عجمی و فارسی اور اردو شاعری میں غزل کے نام سے موسوم ہوئی۔

اگر ان تاریخی حقائق کو پیشِ نگاہ رکھیں تو اس مقام پر چند باتیں بڑی اہم معلوم ہوتی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں قصائد میں نعت کے خاص اشعار کے ساتھ تشبیب کا نہایت شاندار نمونہ ملتا ہے جسے عشقیہ غزل بھی کہتے ہیں اور جس کے رنگ و آہنگ میں فارسی اور اردو میں نعتیہ غزل لکھنے کی روایت قائم ہوئی اور دوسری بات یہ کہ ان میں بعض اشعار نعت سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔یعنی ان کے موضوعات خارجی ہیں جو مختلف حالات و واقعات کا منظر نامہ ہیں جیسا کہ ایک ناقد نے عہد نبوی کی نعت گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"عہدِ نبوی میں مدحِ رسول شعر کی مستقل صنف نہیں تھی اس لئے اس میں جزئیات کی استقصاء بالکل نہیں ہوئی مدحِ رسول عموماً اسلامی تحریک کی حمایت میں کہے ہوئے قصائد کا ایک حصہ

تھی اس لئے نعت سے زیادہ مسلمانوں کی تعریف اسلام کی حمایت اور دشمنوں کی مذمت ان قطعات میں ہوتی تھی نعت میں سراپائے رسول بیان کرنے کی طرف توجہ زیادہ نہیں دی گئی نعت میں ہدایت ربانی اور دعوت کے موضوع کو بیان کیا گیا ہے معجزات کا ذکر ہے مگر بہت کم حضورِ اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمہ، جود و سخا، جرأت واستقلال اور شجاعت و بہادری کا ذکر ہوا ہے اور یہ کہ حضور رہنما ہیں ان کی پیروی ہی میں فلاح ہے۔

ہمارے ناقدین کی ناقدانہ بصیرت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ ابتدائی عربی نعتیہ شاعری کے مزاج اور عصری تقاضوں کو سمجھے بغیر خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔نعتیہ شاعری میں جو عصری آگہی، مذہبی بیداری، تہذیبی و ملی مسائل اور ذاتی تقصیر و بیانِ نفس حیات و کائنات کا داخلی کرب و نشاط وغیرہ جیسے اہم موضوعات کی شمولیت ہونے کے سبب نعت پر غیر صنفی ادب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا جبکہ جدید عربی نعتوں میں بھی شوق سے لے کر عدنان نحوی تک شخصی و ذاتی مصائب و آلام کے ساتھ ملکی و قومی مسائل اور مسلمانوں کی اجتماعی و اخلاقی حالات کو جذبات و احساسات کی بھرپور توانائیوں کے ساتھ بیان ہوتے دیکھا جا رہا ہے۔اور یہی نہیں بلکہ فارسی نعتیہ شاعری قدسؔی و فردوسی خاقاؔنی و قاآنی کے یہاں بے پناہ تغزل ہونے کے بعد بھی عصری ہمک کا اظہار ایک مخصوص فضا میں دیکھا جا سکتا ہے۔اسی کے ساتھ اردو نعتیہ شاعری میں حالؔی و ظفر علی خاں کے یہاں یہ رویہ ایک حد تک جذباتی ہے مگر اقبال نے ایک حد تک شعوری اور فلسفیانہ فضا پیدا کر دی ہے۔

ان باتوں کو قدرے تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت یوں ہے کہ نعت گوئی کا ارتقائی سفر اور تخلیقی رویہ کا تنقیدی محاسبہ کیا جائے تا کہ ایک مخصوص صنفِ سخن کے ظاہری اور باطنی خد و خال سامنے آجائے یوں تو اصنافِ سخن کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک ہیت کے اعتبار سے اور دوسرے موضوع کے اعتبار سے اردو شاعری میں بھی ہیئت کی دو صورتیں ملتی ہیں ایک روایتی اور دوسری غیر روایتی۔ان دونوں ہیئتوں میں نعت گوئی ہوتی رہی ہے پہلی ہیئتیں جو فارسی سے اردو میں آئیں مثلاً غزل، قصیدہ مثنوی، رباعی، قطعہ، ترکیب بند وغیرہ ہیں اور غیر رسمی ہیئتیں جو مغربی

اور ہماری دیسی زبانوں سے اردو میں داخل ہوئیں ان میں بھی نعتیں لکھی گئیں مگر صنف نعت کی الگ کوئی ہیئت اب تک مخصوص نہیں کی جاسکی ہے جبکہ اظہارِ جذبات واحساسات کے لئے بے شمار جدید ہیئتیں بھی وجود میں آگئیں جو مستقل ایک صنف کی حیثیت سے جدید ادب میں نمایاں مقام حاصل کرچکی ہیں مگر صنف نعت جیسی آفاقی شاعری کے لئے اب تک کوئی ہیئت مخصوص نہیں کی جاسکی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شعراء اگر بعنوانِ نعت ایک مخصوص ہیئت یا فارم کے خارجی مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے ہوتے تو نعت ایک محدود پیرایۂ سخن میں سمٹ کر رہ جاتی اور اسکے ہزاروں موضوعات سے نہ صرف مقبولِ عام ہیئتیں محروم رہتیں بلکہ نعتیہ شاعری کو بھی عظیم نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا یہی سبب ہے کہ شعرائے نعت نے اس آفاقی موضوع کے اظہار کے لئے ایک نظریہ عطا کیا کہ نعت کے حقیقی تصورات وافکار کو رائج الوقت اسالیب وہیأت میں پیش کیا جائے کیونکہ ہر زمانے میں ادب کو نئے نئے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور تخلیقی سطح پر اظہار کے مختلف انداز کو قبول کیا جاتا ہے جسے ادبی طور پر ہم تین سطحوں سے دیکھ سکتے ہیں اس کی پہلی سطح شعری تجربہ ہے۔ دوسری سطح ہیئتی تجربہ ہے اور تیسری سطح لسانیاتی تجربہ ہے۔ یہ تجربات جدت وقدامت اور انفرادیت کے رجحانات ومیلانات کے تحت ادب، عصری شعور اور ہر عہد کے ادبی تقاضوں کی بنیاد پر کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر ہوتے ہیں یا کئے جاتے ہیں۔ اگر نعتیہ شاعری کے ارتقائی سفر کا تنقیدی جائزہ ان خیالوں کی روشنی میں لیا جائے تو صنف نعت کے ناقدین اطمنان بخش نتائج تک پہنچ سکتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک جگہ نعت کا حقیقی عنصر تلاش کرتے ہوئے اجمالی طور پر ہیئت کے تعلق سے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ

''میں نے اکثر سوچا کہ نعت کا کون سا عنصر حقیقی معنوں میں اثر وتاثیر کا باعث ہوتا ہے جسے نعت کا مرکزی عنصر کہا جاسکے۔ غور کرنے سے محسوس ہونے لگا کہ یہ عنصر نیاز وعجز نہیں یہ عنصر فقط اشتیاق بھی نہیں دعا وطلب وشفاعت بھی نہیں یہ محض تعریف اوصاف رسول پاک بھی نہیں یہ کچھ اور ہے جو کسی ایک بات پر منحصر نہیں یہ بہت کچھ ہے، بہت کچھ جمع کرنے سے ہے یہ سوز بھی

ہے، یہ اشتیاق بھی ہے، یہ طلب بھی ہے، یہ تواضع بھی ہے، یہ دعا بھی ہے، یہ سب کچھ ہے۔غرض کہ اس کا مرکزی عنصر ایک نہیں ۔ یہ سب اوصاف جب تک ہم آویز نہ ہو جائیں نعت میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے رنگ کی نعت معمولی بے احتیاطی سے اپنے درجہ سے گر جاتی ہے اور قصیدہ کی نعت کوئی درجہ متعین نہیں کر سکتی ،شوق و اشتیاق سے خالی نیاز مندی محض دعا بن جاتی ہے نعت نہیں رہتی اور محض قومی و ملی رنگ کی نعت رجز میں بدل جاتی ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس اگر چہ طویل ہو گیا ہے مگر میں نے جو باتیں گزشتہ سطروں میں بیان کی ہیں انھیں تقویت بھی عطا کرتا ہے۔ساتھ ہی خالص نعت جو اپنے اندر اثر و تاثیر کی بے پناہ خصوصیت رکھتی ہے اور جس ہیئت میں اثر و تاثیر کھو دیتی ہے ان تمام باتوں کا احاطہ ہو گیا لیکن اس کے باوجود کچھ باتیں اُلجھن پیدا کر گئی ہیں۔ مثلاً یہ بات تو اپنی جگہ دُرست ہے کہ کسی بھی ہیئت میں نعت لکھی جائے لیکن نعت کا حقیقی عنصر ہونا ضروری ہے۔ جو اثر و تاثیر سے مزین کرے اگر ہیئت کو معنیٰ کا حصہ تصوّر کر لیا جائے تو بات کچھ دور تک نکل سکتی ہے لیکن اگر محض ظاہری ساخت پر اثر و تاثیر کے مسئلہ کو دیکھا جائے تو یہ ایک غیر صحت مند تنقید کی علامت بن جائیگی ۔پھر اس بات کو کس حد تک دُرست سمجھا جائے کہ دیگر اصناف سخن میں جو نعتیں لکھی گئی ہیں اس کا دائرۂ تاثیر محض نعت ہونے کے سبب ہے یا پھر محض ہیئت نے نعت کو اثر و تاثیر سے نواز دیا جبکہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں نعت کی تخلیق مواد اور ہیئت کے باہمی امتزاج سے ہوتی ہے۔ان باتوں کی روشنی میں فرمان فتح پوری کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''عام طور پر نعت کے لئے وہی پرانی ہیئت استعمال ہوتی رہی ہے یعنی زیادہ تر غزل کی شکل میں نعتیں کہی جاتی ہیں۔طویل نعت ہو تو قصیدہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔اس لئے کہ غزل اور قصیدہ کی ہیئت ایک ہی ہے۔ پرانی ہیئتوں میں شعر کہنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ شاعر کو اظہار خیال کے لئے ایک بنا بنایا سانچہ مل جاتا ہے اس سانچے میں پرانی ترکیبیں، تشبیہیں، علامتیں اور تلمیحات بڑی آسانی سے جگہ پاتی ہیں شعر آسانی سے موزوں ہو جاتا ہے اور چونکہ عوام الناس ان

سانچوں اوران کے رنگ وروپ سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں اس لئے بقدر ظرف ان سے لطف اندوز ہونے یا ان کے مفہوم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ظاہر ہے کہ ایسی نعتیں مشاعروں کے لئے ،سیرت کے عام جلسوں کے لئے بہت موزوں ہوتی ہیں ۔شوق سے سنی جاتی ہیں اورنعت کے ساتھ نعت گو کی شہرت کو بھی دور دور تک پہنچادیتی ہیں لیکن فکروفن کے اعتبار سے عموماً ان نعتوں کا رتبہ زیادہ بلند نہیں ہوتا۔ جدّت اور انفرادیت بھی ان میں نظر نہیں آتی اس لئے موضوع سے قطع نظر جب اعلیٰ درجہ کی شاعری زیر بحث آتی ہے تو عام طور پر نعتوں کا یہ ذخیرہ خود بخود نظرانداز ہوجاتا ہے۔“

ان باتوں کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ نعت کی طویل فکری خدمات اورفنی وسعتوں کو فراموش کردیا جائے ۔یوں بھی کسی صنف سخن کے سرمائے اور خزانے تمام کے تمام معیاری نہیں ہو سکتے اسے فکروفن اوراصول وضوابط کے میزان پر تول کر ہی کچھ مخصوص حصوں کا درجۂ معیار متعین کیا جاتا ہے اور یہی حال نعتیہ شاعری کا بھی ہے۔مثال کے طور پر اردو شاعری میں اگر میرؔ اور داغؔ دہلوی کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مرزا داغؔ کا موضوع اردو غزل کی خالص عاشقانہ شاعری ہے اس نے اپنے موضوع سے متعلق ہیئت اوراس ہیئت کی تکنیک کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے لیکن اس کے باوجود مرزا داغؔ اردو کے بڑے شاعروں میں نہیں کیونکہ ان کی شاعری کا مواد اعلیٰ اقدار کا حامل نہیں ہے۔ادب کی فطرت کا انحصار اس کے مواد پر ہے۔جس کے اندر قدریں پیش کی جاتی ہیں اور دوسری بات یہ کہ نعتیہ شاعری میں انفرادی رویوں اور جدّت وندرت کے ساتھ جونئی نئی ترکیبیں، تشبیہیں ،علامات اور تلمیحات کے تحت قائم ہوتی ہیں انھیں اصول شریعت کی روشنی میں پہلے دیکھا جاتا ہے اور پھر شعری ذوق کی تسکین کے لئے قبول کیا جاتا ہے ورنہ بقول ڈاکٹر سید طلحہ رضوی برقؔ ”ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے کہ شعرائے متاخرین کی نعت گوئی میں فرق مراتب کے باوجود ذیل کی خصوصیات مشترک ہیں۔

(۱) رسول اللہ ﷺ کی شان میں عاشقانہ الفاظ وصل ،ہجر ،فراق اور بے تابی وغیرہ کا

استعمال کیا گیا اور اسی حیثیت سے آپ کے خد و خال، زلف و گیسو، لب و دہن اور چہرہ ورخسار وغیرہ کی تعریف وتوصیف کی گئی۔

(۲) معنیٰ سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا یعنی جدید استعارے پیدا کئے گئے ہیں اور رعایت لفظی وصنعت تضاد وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔

(۳) بہت سی ضعیف روایتیں اور معجزات نظم کئے گئے ہیں۔

شاعرانہ مبالغہ طرازیوں میں صحیح واقعات اور مستند روایات کی صورت بھی بدل گئی ہیں۔"

اردو نعتیہ شاعری کا تنقیدی سرمایہ جسے شرعی وادبی حیثیت مکمل طور پر حاصل ہو۔ بہت ہی مختصر نظر آتا ہے۔ برسوں کے تنقیدی سرمائے جنکی روشنی میں صنف نعت کی ظاہری ہیئت اور باطنی ساخت کا محاسبہ کیا جائے تو وہی انداز سامنے آئیگا جو مشرقی تنقید کا خاصہ ہے یعنی چند تنقیدی اصطلاحات کے پیشِ نظر لوگوں نے نعتیہ شاعری کی پرکھ کی ہے۔ جس میں وہی فصاحت وبلاغت، سلاست وروانی، روزمرہ محاوروں، بندشِ تراکیب، تشبیہ اور استعارے کے روایتی پیمانے کے تحت ان کی تعبیر وتشریح کی ہے اور بعض جدید تنقیدی زاویے کے تحت جو اصطلاحات پیش کئے گئے ہیں ان میں داخلیت، خارجیت رمزیت، اشاریت، خطابیت، علامیت وغیرہ کی روشنی میں چند تحریریں نظر آتی ہیں جو علمی وفکری اعتبار سے درجۂ امتیاز حاصل کرنے کی قوت رکھتی ہیں ورنہ بیشتر تحریریں تذکرہ اور تأثراتی دائرے میں گردش کرتی نظر آتی ہیں جن سے تحقیق وتنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ان باتوں سے مجھے علم بیان وعلم عروض کی اہمیت وافادیت اور شاعری میں اس کی ضرورت سے انکار ہرگز نہیں مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جو لفظ سو سال قبل فصیح تھا جو طرزِ اظہار پسندیدہ تھا اب سماجی تغیر وتبدل کے اثرات اور لسانی ارتقا کے عمل سے ویسا نہیں رہ گیا جو جدید انداز بتائے جا رہے ہیں انھیں صرف ایک مخصوص دائرے میں رکھ کر ہی جدید تخلیقات کا مطالعہ کرنا بھی مناسب نہیں کیونکہ لغت گوئی کے سلسلے میں قدیم وجدید کا کوئی ایسا تصور ہرگز نہیں کہ لوگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تیار کرلیں اور اپنی خود ساختہ ادبی وفکری ہیولے کی نعرہ باز

حمایت کریں۔ نعت گوئی کا بنیادی تقاضا ہی یہی ہے کہ اگر انسان پندرہویں صدی میں ہے تو وہ عہدِ نبوت میں سانس لے اس زاویۂ نگاہ کے تحت اردو نعتیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ کرنا چاہئے جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسن عسکری نے محسن کاکوروی کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اردو میں آنحضرت ﷺ کو "ایک شخصیت" تو حالؔی نے اپنے مسدس میں بنایا اور اس طرح نعت گوئی کی روایت کو سخت نقصان پہنچایا۔ حالؔی کی نعت کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت کا کردار نہایت بلند تھا اور ان سے ہمیں بڑے فائدے پہنچے۔ بلند کردار کے لوگ انسانیت کو فائدے پہنچانے والے تو بہت ہوئے۔ مگر ان سے لاکھوں انسانوں کی ایسی والہانہ محبت کیوں نہیں ہوئی جیسی آنحضرت سے ہے؟ اس کا جواب حالؔی کی نعتوں میں نہیں ملتا۔ بہی کھاتے میں ایسی باتیں ہوا بھی نہیں کرتیں ...... محسن کے یہاں حساب وکتاب ناپ تول اور جانچ پرکھ کا سلسلہ نہیں۔ رسول کے بارے میں انکا تصور وہی تھا جو آج سے سو سال پہلے۔ یعنی مغرب پرتی، عقل پرستی اور خود پرستی سے پہلے سب مسلمانوں کا تھا یعنی بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔ ظاہر ہے اس طرح کی جرأت مند تنقید حسن عسکری جیسا صاحب نگاہ ناقد ہی کر سکتا ہے اس طرح کی مثالیں جسے ادبی اعتبار حاصل ہو نعتیہ شاعری کی تنقید میں خال خال ہی نظر آتی ہیں ☆

(مطبوعہ ۱۹۸۵ء، نور القمر پٹنہ، نوائے حبیب کلکتہ)

نوٹ:۔ مذکورہ مضمون ۱۹۸۲ میں ہوڑہ کی ایک ادبی انجمن کی فرمائش کے پیشِ نظر لکھا گیا۔ اس مضمون میں ایامِ نومشقی کی جھلکیاں صاف نظر آئیں گیں جسے بطور یادگار محفوظ کی گئیں ہیں۔ اس مضمون سے ہم عصر اربابِ قلم کو موضوع نعت پر لکھنے کی تحریک ملی۔

نعت کے موضوعات

دنیائے شعروادب میں نعت کا موضوع جس قدر پاکیزہ مقدس اور نازک ہے
اسی طرح وسیع و ہمہ گیر بھی ہے۔اس صنف سخن کی نزاکت و لطافت کا یہ عالم ہے کہ بارِ شبنم سے بھی
شاخِ سخن لچک پڑتی ہے مگر دوسری طرف قوتوں اور وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ قرآن اور حدیث کی بے
مثال ولازوال فکری و معنوی تجلیوں سے شبستانِ سخن کو معمور و منور کردیتی ہے۔اس کے باوجود ہمارے
بعض ناقدینِ ادب نے نعت کو ایک محدود موضوعاتی شاعری کے نام سے موسوم کر کے اسکی وسعتوں
اور معنوی امکانات کو محدود کرنے کی سعئی لاحاصل فرمائی ہے۔شاید انکی نگاہ اس بسیط حقیقت سے آشنا
نہ ہوسکی جہاں ایک عارف حق کی نظر پہنچ کر دعوت فکر دیتی ہے۔

جو شئے تری نگاہ سے گزرے درود پڑھ
ہر جز و کل ہے مظہرِ انوارِ مصطفٰے

لھذا سب سے پہلے ہمیں غور کرنا ہے کہ نعت کے موضوعات کیا ہیں اور نعت کو
آفاقی صنفِ سخن کا درجۂ اعتبار حاصل ہے یا نہیں۔اردو ادب میں نعت کا لفظ ایک اصطلاحی معنٰی و
مفہوم رکھتا ہے جیسا کہ ایک ناقد کا خیال ہے۔

"نعت دراصل ایک موضوع کا نام ہے لہذا جب لفظِ نعت کا استعمال کیا جاتا ہے تو وہ
تمام ذخیرہ مراد ہوتا ہے جو آنحضور ﷺ کے فضائل و مناقب اور شمائل پر مشتمل ہے خواہ نثر میں ہو یا
نظم میں نثری نعت کو اصطلاحا محامدِ رسول کا ایک جدا نام دے سکتے ہیں۔لہذا مسلم شریف کا باب
"کتاب الفضائل "بخاری شریف کا باب" کتاب المناقب القریش، امام ترمذی کی کتاب"
شمائل ترمذی حتیٰ کہ درود تاج بھی اسی نثری نعت کے تحت آتا ہے ماضی میں بھی ان نثری محامد کو نعت
ہی سمجھا گیا ہے۔قرآنِ کریم کی جن آیات پر نعتِ رسول کا اطلاق ہوتا ہے وہ بھی اسی اصطلاح کے
زمرہ میں آئیں گی"

دراصل اصطلاحی طور پر نعت کی صنف ہر زمانے میں معنوی وسعت اختیار کرتی رہی۔ہے اور ہر

عہد میں روشن خیال اربابِ فکر و دانش نے اس بحرِ بے کنار سے گوہر آبدار چنے ہیں۔ جن کے خیالات کی روشنی میں یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ ایسی تمام منظومات جن میں رسولِ خدا ﷺ سے محبت و عقیدت کا اظہار کیا جائے اور انکی عظمت و فضیلت بیان کی جائیں نعت کی تعریف میں آتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اربابِ ادب نے یہاں تک فرمایا کہ ''ایسی تمام نظمیں جن کا تأثر ہمارے ذہن کو حضور سید کائنات کی بارگاہ سے قریب کردے اسے بھی نعت ہی کا درجۂ اعتبار حاصل ہے۔ اس طرح نعت کی عظمت جہاں روشن ہوتی ہے وہیں موضوعات کی گہرائی و گیرائی کے جلوے بھی سامنے آتے ہیں۔

نعت کے موضوعات کا احاطہ کرنا بھی ناممکن ہے کیونکہ نعت جہاں حضور رحمتِ تمام ﷺ کے زلف و لب، سراپا و سیرت، صفات و معجزات اور احکامات و پیغامات کا فکری و فنی اظہار سے عبارت ہے وہیں نعت ہماری ذات اور کائنات سے بھی نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ جو بنی نوع انسان کے لئے آفاقی ادب کا سرچشمہ ہے۔ جس کے تحت عشقِ الٰہی، محبتِ رسول، احترامِ نبوت و رسالت، انسانیت شناسی، عرفانِ زندگی شعورِ بندگی، خود آگہی و خداشناسی، خداوند قدس کی رضاجوئی کا دائمی طرزِ فکر و عمل دنیا و عقبیٰ میں شفاعت اور رحمت طلبی، دیدارِ رسول کی حسرت، جوارِ حبیب کی تمنا، اپنے نفس کی مذمت، احساسِ گناہ پر ندامت، اپنی وفاشعاری و خوش بختی کا تحدیثِ نعمت کے طور پر اظہار، زمانے کے مصائب و آلام سے نجات پانے کے لئے درِ رحمت للعالمین پر استغاثہ و فریاد جیسے مختلف موضوعات سے نعت کا فکری نگارخانہ جگمگاتا رہتا ہے۔ اگر نعت کے موضوعات کو سمیٹ کر بھی بیان کئے جائیں تو ایک عظیم دفتر ہو جائے۔ مگر آسانیٔ فہم کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ نعتِ رسول کے موضوعات دو اہم بنیادی سطحوں پر استوار ہوتے ہیں۔ ایک طرف رسولِ رحمت ﷺ کا دنیوی و اخروی امتیاز و اختصاص ہے تو دوسری جانب نبیٔ رحمت ﷺ کی امت کا دنیوی و اخروی اعزاز و اکرام کا بیان ہے اور اس کی تیسری سطح رحمت للعالمین کے عالمگیر اقدار اور رحمتِ کونین کے تصورات ہیں۔ جو ہر فرد بشر بلکہ تمام مخلوقات کے لئے ہیں۔ چونکہ اس آفاقی ادب کا رشتہ قرآن و حدیث سے ہے جسکا نظامِ فکر و عمل اپنی جامعیت کے تحت حیات و کائنات کے تمام گوشوں اور شعبوں کی تقدیم و اصلاح کے ساتھ ایک انمول حیات کا منظرنامہ عطا کرتا ہے۔ اس لئے نعت میں جہاں مصطفےٰ جانِ رحمت ﷺ کے

حقیقی پیغامات واحکامات اور سیرتِ مقدسہ کی خصوصیات کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے اسی کے ساتھ نعت اپنے دائرۂ اظہار میں عام انسانی زندگی پر کن صورتوں میں اثر انداز ہوئی اور ایک عہد سے دوسرے عہد کا تاریخی سفر کرتی ہوئی کس طرح گزری مختلف رنگ و آہنگ اور مزاج وشعور کے ساتھ اپنے موضوعات کے وسیع تر دامن میں یہ ساری چیزیں رکھتی ہے۔

لیکن ہمارے بعض ناقدینِ ادب محض چند عمومی باتوں یا واقعات وخیالات کی تکرار کو دیکھنے کے بعد یہ حکم صادر کر دیتے ہیں کہ نعت کا موضوع محدود ہے۔حالانکہ اگر وہ چاہیں تو موضوعات کی نوعیت ،ماہیت اور روایت ودرایت ہی کے تصورات کو سامنے رکھکر اپنے شکوؤں کا حل تلاش کرسکتے ہیں ۔اگر یہ اندازِ فکر ونظر ان کے لئے نا قابلِ عمل ہو تو کم از کم نعت کے بنیادی اور براہِ راست موضوعات سے ایسے گوشے نکال کر تزئینِ سخن کا اہتمام کر سکتے ہیں ۔مثلاً حضور رحمتِ تمام ﷺ کی سوانح وسیرت کے انفرادی اوصاف وکمالات جن میں حضور کا خاتمِ نبوت ہونا ،امامِ انبیاء ہونا ،رحمتِ کونین ہونا،محبوبِ رب لعالمین ہونا ،حسب ونسب میں اعلیٰ ہونا ،جسمانی حسن وجمال میں بے نظیر ہونا ،صاحبِ خلق عظیم ہونا،قول وفعل میں یکساں ہونا ،پیغمبرانہ اوصاف کے تحت عالمِ انسانیت کا قایدِ اعظم ہونا ،جیسے اوصافِ حمیدہ کے ساتھ معجزات وکمالات کو پیشِ نظر رکھ کر ہزاروں اوراق کے دفتر لگا سکتے ہیں ۔اسکے علاوہ اعمال ،افعال اور تعلیمات کے تحت زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں کے لئے ایک لازوال اور بے مثال Ideal کا تصور سامنے رکھ کر زندگی وبندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں ۔دوسری صورت یہ ہے کہ نبی رحمت ﷺ سے متعلق ومنسوب اشیاء اور شخصیات سے عقیدت ومحبت مثلاً گنبدِ خضریٰ ،جوارِ مدینہ ،ارضِ حرم وغیرہ نیز آپ کی آل واصحاب ،ازواجِ مطہرات سے عقیدت رکھنا اور انکے کردار وافعال کی نورانیت کو اپنی حیات کے لئے مشعلِ راہ بنانا۔۔۔۔۔۔ذاتِ معجز صفات کا ہر پہلو اس قدر روشن وتابناک ہے کہ کسی بھی گوشہ حیات کے کسی بھی پہلو کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ فلاں پہلو مکمل طور پر اجاگر ہو چکا ہے اور فلاں پہلو پر اب مزید لکھنے کی گنجائش نہیں کیونکہ حضور کریم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ ایک منارۂ ہدایت ہے یہی اسباب ہیں کہ نعت کے موضوعات کا دائرہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیلتا جارہا ہے اور پھیلتا ہی

جائے گا کیونکہ انسانی فکر جب بھی اور جہاں سے بھی رحمت تمام کو پکارے گی وہاں رحمت کی تقدس مآب کرنیں پہنچ کر ہدایت کے جلوے بکھیرتی رہیں گی۔ نعت کے موضوعات دراصل اپنے مرکز و محور میں گردش کرتے ہیں لیکن جب انسانی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات اس کے دائرے سے مس ہوتے ہیں تو اس میں نئی معنویت کی لہریں بیدار ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ جدید عہد میں مادی ایجادات کی قیامت خیز بالا دستی سے روح انسانیت چیخ رہی ہے اور اخلاقی و تہذیبی قدریں ریت کی طرح بکھر رہی ہیں۔ انسان میں، مشین میں، اور حیوان میں فرق و امتیاز کا تصور موہوم و معدوم ہو چلا ہے اس عالم کرب میں روح ہے اور رحمت تمام کی عالمگیر رحمت۔ یہی رحمت للعالمین کی رحمت کے تصور نے روح انسانیت کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا ہے۔ دنیا صحرائے حیات میں پا بجولاں چل رہی ہے اور رحمت تمام کی رحمت روح کی انگلیاں تھامے نئی حیات کا مژدہ سنا رہی ہے۔ ذرا اس پس منظر میں اردو کی جدید نعتیہ شاعری کو دیکھیں۔ موضوعات کی وسعتوں کا جائزہ لیں حیات اور کائنات کے عصری مسائل کا تجزیہ کریں۔ تو ہر قدم پر وسعتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونگے۔ جیسا کہ صاحبانِ فکر و نظر فرماتے ہیں کہ آج بھی سیّد المرسلین کے احسانات کی چادر کے نیچے پوری انسانیت نظر آتی ہے۔ تاریخِ بشریّت نورِ اوّل کی رحمت سے مستنیر ہے۔ علم و آگہی، شعور و عرفان، معلمِ اوّل کی عطا ہے۔ ہر زمین اور ہر زمانہ کی ہدایت کے لئے سراج منیر کی ضوفشانیاں عام ہیں آج بھی نبیٔ آخر کا ہر فرمان ہدایت کی علامت اور آپ ﷺ کا ہر فعل عظمتِ کردار کا نشان ہے۔ آج بھی حرا کی روشنی سب سے دلکش اور فاران کی آواز سب سے دل گداز ہے۔ آج بھی فتحِ مکہ بے عیب ضابطۂ اخلاق اور خطبۂ آخر لاریب عالمی منشورِ حیات ہے۔ آج بھی طائف کا واقعہ مظلوم کی فتح کا حوالہ اور ہجرتِ حبشہ ضعیف کی قوت کا استعارہ ہے۔ آج بھی معراجِ مصطفٰے بشری استعداد کے لئے ہدف اور چیلنج ہے۔ آج بھی ہجرتِ مدینہ معاشرت کے احکام کی دلیل ہے اور صلحِ حدیبیہ سیاست کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اگر ہمارا ماضی ہمارے حال میں ضم ہو جائے تو یہی آج مستقبل کا اشاریہ ہوگا آج میرا یہ خیال ہے کل دنیا گواہی دے گی۔ ☆☆☆

نعت کے محرکات

نعت گوئی کے محرکات کو بیان کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض ناقدینِ ادب کا خیال ہے کہ نعت کوئی صنف نہیں ہے۔اس میں کسی نہج سے ندرت وجدت کی گنجائش نہیں۔ موضوعاتی اور روایتی شاعری میں تخلیقی عمل کی جلوہ ریزی ممکن نہیں ۔اسلئے کہ شخصی سیرت کے دائرے میں گردش کرنے والی شاعری میں افکار وخیالات اور جذبات واحساسات کی وہ رنگارنگی نہیں دیکھی جاسکتی ہے جو خالص شاعری کی مثالیں ہیں۔

اس طرح کے غیر صحت مند اعتراض سے مقصود یہ ہے کہ نعت نگار احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں اور نئی نسل کا رشتہ نعت گوئی سے منقطع ہو جائے۔دراصل ان اعتراضات کے پیچھے مغربی تہذیب اور ملحدانہ افکار کے ساتھ صیہونی تحریک بھی کام کر رہی ہے جنکا مقصد اسلام دشمنی کے علاوہ کچھ اور نہیں ۔مگر افسوس ان روشن خیال دانشوروں پر ہوتا ہے جو غیر شعوری طور پر ان کے بچھائے ہوے جال میں الجھ کر بڑی سادہ لوحی سے انکی تقلید کرتے ہیں۔اور خود کو مکمل مسلمان بھی تصور کرتے ہیں۔

ادب کی کسی بھی صنف کو غیر تخلیقی ادب سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا اور یہ حکم بھی نہیں لگایا جاسکتا کہ فلاں موضوع تخلیقی ہے اور فلاں موضوع غیر تخلیقی۔دراصل یہ مسئلہ صاحب فکروفن کا نجی اور ذاتی ہے۔اگر اسکے اندر صلاحیت ہوگی تو وہ اپنی پوری قوت وتوانائی کے ساتھ بے جان لفظوں میں خونِ جگر کی آمیزش سے معنویت کی لہریں بیدار کردیگا۔میر کا شعر ہے

سرسری ہم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ایک مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں مثلاً ایک شاعر اپنے مصائب وآلام یا ذاتی طور

پر مدینے سے دوری ومہجوری کی کیفیت کا انتہائی کرب انگیز صورت میں اظہار کرتا ہے اور اپنے اظہار میں صداقت وحقیقت کا شعوری طور پر خیال بھی رکھتا ہے تو دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس کے اشعار میں ایک نوع کی انفرادیت کے علاوہ اجتماعی جذبات واحساسات کی مصوری بھی ہو جاتی ہے۔
اس طرح شاعر کی کیفیت میں قاری وسامع بھی شریک ہو جاتے ہیں۔اس صورت میں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ صنفِ نعت غیر تخلیقی صنفِ سخن نہیں۔

اگر ہم نعت گوئی کے محرکات پر توجہ دیں اور وہ بنیادی اسباب تلاش کریں جس کے تحت نعت گوئی ہر عہد میں ہوتی رہی ہے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائینگے۔ اربابِ فکر ونظر کا خیال ہے کہ کسی بھی اعلیٰ ادب کی بناء محبت کے تین محرکات پر ہوتی ہے۔

(۱) حسن وجمال (۲) فضل وکمال (۳) جود ونوال

(۱) **حسن وجمال** :- فطرتِ انسانی میں ازل ہی سے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ وہ صاحب حسن وجمال سے محبت کرے۔ اِس سے متاثر ہونا فطرت کا تقاضہ ہے کیونکہ اَللّٰهُ جَمِيلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَال کا تصور انسان کو فطرتِ سلیمہ کے ساتھ قربِ الٰہی سے قریب رکھتا ہے۔اب حضور سیدِ کائنات ﷺ کے حسن وجمال کے متعلق قرآن وحدیث کے شواہد کے ساتھ اصحابِ رسول کے ایمان افروز روایات وتأثرات موجود ہیں کہ اسی حسنِ بے نقص کے صدقے میں عالمِ رنگ وبو میں رعنائیاں وزیبائیاں نظر آتی ہیں۔اگر یہ حسنِ مکرّم وجمالِ محتشم کو ربّ کائنات وجود نہ بخشتا تو سارے حسن وجمال کے افسانے وجود ہی میں نہ آتے۔اسلئے نعت میں جمالِ نبوّت اور حسنِ رسالت کا خاص طور پر جلوہ نظر آتا ہے۔

(۲) **فضل وکمال** :- جس ذات میں فضل وکمال کے عناصر ہوتے ہیں وہ دنیا میں باوقار کہلاتی ہے۔فطرتِ انسانی اس ذات کی افضلیت وکمالات کا برملا اعتراف کرتی ہے۔ اِس رُخ سے سیدِ کونین ﷺ کی ذات عالی صفات یکتائے عالم نظر آتی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے

اپنے محبوب کو فضل وکمال کا ایسا نمونہ بنا کر بھیجا کہ عظمت وبزرگی کا تصور "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کا محور ومرکز بن گیا۔ نعت میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اس نظامِ فکر کو ہی بڑے اہتمام کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

(۳) **جُود ونوال**:- انسان چونکہ ہمیشہ سے احسان شناسی کا قائل رہا ہے کیونکہ یہی شرافت واخلاق ہے۔ نبی رحمت ﷺ کے مہر وعطا اور جود وسخا کا تصور اس قدر بسیط ہے کہ انسانی فکر وخیال کی ساری قوتیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔ آپ کی بارگاہ سے حیات وکائنات کو سب کچھ ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سلیم الفطرت ہمہ دم آپ کے ذکر وفکر میں محصور ہے۔

مذکورہ بالا خیالات نعت گوئی کے معنوی محرکات ہیں۔ ان کے علاوہ اگر تاریخِ ادب اور تاریخ انسانیت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہر گوشۂ حیات سے مدحتِ مصطفٰے کی تحریک ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے کیونکہ تہذیب وتمدن، ثقافت وکلچر، واخلاقی قدریں مکمل تاریخ کی روشنی میں عروج وارتقا کی منزل سے جہاں ہمکنار ہوتی ہیں وہاں رحمتِ کونین کی رحمت مآب کرنیں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

ذرا سوچئے جس صنفِ سخن میں صدیوں کے جذبات وخیالات کی جلوہ سامانی ہو، جس کا موضوعاتی سفر ازل سے ابد تک قرآنی نظامِ فکر کے ساتھ دیگر آسمانی صحیفوں پر محیط ہو، جسکی مدحت خود خالقِ کونین فرماتا ہو، انبیاء ومرسلین، علماء، فقہا، صوفیا یہاں تک کہ غیر مسلم دانشوروں، روشن خیال مورخین مسلسل کررہے ہوں تو اسی تواتر سے ثابت ہے کہ غیر تخلیقی عمل اس صنف میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ سطروں میں عرض کیا ہے کہ کسی بھی صنف پر غیر تخلیقی ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ بلکہ تخلیق کاروں میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کون کس صنف سے ذہنی وقلبی وابستگی رکھتا ہے پھر انکی نمائندہ تخلیقات کا جائزہ لیا جائے۔

اس موقع پر مناسب سمجھتا ہوں کہ چند باتیں صنفِ نعت میں تخلیقی عمل کے متعلق بھی بیان کردوں تاکہ شبہات کا ازالہ ہوجائے اور ساتھ ہی نعت نگاروں کی شخصیت بھی سامنے آجائے۔ ممکن ہے کہ اس

خیال کی روشنی میں ناقدین ادب توجہ فرمائیں۔

نعت کا تخلیقی سفر ایک عاشقِ رسول کن صورتوں میں کرتا ہے اور کتنی دشوار گزار منزلوں کو عبور کرنے کے بعد کس طرح یہ تخلیقی سفر ایک شعری قالب میں ڈھل کر ہم تک پہنچتا ہے اسکا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔جس کا ذکر گزشتہ سطروں میں موضوعات کی وسعت اور تخلیقی محرکات کے تحت کر چکا ہوں یہاں صرف ایک اشارہ مقصود ہے۔ مثلاً ایک شاعر اپنی گنہگار زندگی کا تصور کرتا ہے اور اس خیال میں ڈوب کر ساحلِ نجات تک پہنچنا چاہتا ہے کہ اسکی نگاہ میں احکامِ خداوندی آتے ہیں کہ ”جب تم اپنی جانوں پر ظلم کر جاؤ یعنی کوئی گناہ تم سے صادر ہو جائے تو بارگاہِ نبوّت و رسالت میں ندامت کے ساتھ حاضر ہو اور محبوبِ ربّ کو نین کو وسیلہ بنا کر خداوند تعالیٰ سے مغفرت چاہو تو اللہ ربُّ العزت اپنے محبوب کے صدقے تمہاری جانوں پر رحم فرمائیگا۔“ اس تصور کی روشنی میں شاعر جب پر خلوص جذبوں کے ساتھ دربارِ رسول کی جانب متوجہ ہوتا ہے اس کے ذہن و قلب میں فکر و خیال کے سینکڑوں دریچے کھل جاتے ہیں۔جن میں دنیا کے مصائب و آلام کے ساتھ عذابِ قبر، قیامت کی ہولناکیاں ،دوزخ کے دردناک عذاب کے حقائق ہوتے ہیں اور ساری چیزیں قرآن و احادیث کے ارشادات کے ذریعہ علم و شعور کے نہاں خانوں میں پہلے ہی سے ہوتی ہیں۔اب شاعر ان مناظر کی کربناکیوں کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے۔ان کیفیات میں بیحد سوز و گداز کا پہلو بھی پوشیدہ ہوتا ہے اس کے بعد اس کی نگاہ باب رحمت کی طرف اُٹھ جاتی ہے جہاں رحم و کرم ، جود و سخا، مہر و عطا اور عفو و درگزر کے جلوے نظر آتے ہیں اور وہ فریاد و التجا کے بعد اپنے دلی احساسات و جذبات کو اپنے فکری نگارخانے میں سجاتا نظر آتا ہے۔جس میں داخلی کیفیات کی بھرپور جلوہ ریزی ہوتی ہے۔

اگر ان باتوں کے بعد بھی کہا جائے کہ نعت گوئی کوئی صنفِ سخن نہیں یا اس کے موضوعات محدود ہیں تو اسے تنگ نظری کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

نعت گوئی کے محرکات اور وسیع و بسیط موضوعات اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ تمام آفاقی اصنافِ سخن میں نعت گوئی ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے جسے آج تک کسی

ہیئت یا فارم تک محدود نہیں رکھا جا سکا۔ جس کا سبب نعت کے ہمہ گیر موضوعات ہیں کہ شاعر جس ہیئت میں موضوعِ نعت کو فکری و قلبی وسعتوں کے ساتھ ہمکنار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اسی فارم کو استعمال کرے۔ اس طرح کے مسائل ہمارے ناقدینِ ادب کے لئے صبر آزما ہو جاتے ہیں۔

دراصل کسی بھی اصناف میں وہ دشواریاں پیش نہیں آتی ہیں جو صنفِ نعت کے سلسلے میں آتی ہیں۔ اسی لئے صنفِ نعت کا ایک اہم تقاضہ شریعت کی مکمل پاسداری ہے جو نعت کی ظاہری و معنوی ساخت اور نظامِ فکر و خیال کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھتی ہیں۔ قوانینِ اسلام کی روشنی میں ایک فنکار کی فکری و وجدانی لہریں بڑی سبک خرامی سے سفر کرتی ہیں اور اسے اسلام مخالف رجحانات و میلانات سے دامن بچا کر گزرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

اگر شرعی قوانین کا علم نہ ہو تو اولاً نعت گوئی ممکن نہیں دوم نعت گو افراط و تفریط کا شکار ہو کر اپنی عاقبت برباد کر لے گا۔ اسی لئے اعلیٰ درجہ کی نعتیہ شاعری کے لئے صرف فنی لیاقت و مہارت اور قدرتِ کلام ہی سب کچھ نہیں بلکہ ان علوم و فنون سے زیادہ مقامِ رسالت و نبوّت کا سچا احترام، وحدانیت و رسالت کے فرق و امتیاز کا حقیقی عرفان، مقامِ عبودیت اور محبوبیت کے رموز و اسرار سے آگاہی اور حضور سے بے پناہ عشق و محبت لازمی تقاضے ہیں۔ ان امور کے علاوہ دینِ فطرت اور محسنِ انسانیت کے عالمی اور آفاقی احکامات و نظریات کا خاطر خواہ ادراک ہونا بھی ضروری ہے جسکی روشنی میں بنی نوعِ انسان کے عصری مسائل کو صحت مند قدروں سے آشنا کرنے کی قوّت ملتی ہے۔ یہ ساری چیزیں جب ہمارے علم و شعور کے نہاں خانے میں سمٹ آتی ہیں اور فکر و خیال کو گہرائی و گیرائی عطا کر دیتی ہیں تو نعت میں ایمان و عرفان کی کثرت اور خلوص و صداقت میں ایسی جلا پیدا ہو جاتی ہے جس سے حسنِ معانی کے ہزاروں عالم نظر آنے لگتے ہیں۔ چلتے چلتے دو باتوں کی وضاحت کر دوں۔

اربابِ شعر و ادب کو "تلمیذ الرحمٰن" کہنے کا سلسلہ خدا جانے دنیائے شعر و ادب میں

کب سے چل رہا ہے۔ اور جدید دور میں شاعر کو تخلیق کار، اور اسکی فکری کاوشوں کو تخلیق اور انکے اس کام کو تخلیقی عمل جیسے لفظوں سے تعبیر کیا جارتا رہا ہے لیکن فقہائے دین متین کے نزدیک ان لفظوں سے کسی مخلوق کو تعبیر کرنا درست نہیں شرعی زاویۂ نگاہ سے خالق صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے اور صفتِ تخلیق اسی کو زیبا ہے۔

لیکن اس بات سے بھی صرف نظر ممکن نہیں کہ یہ اصطلاحات اہل شعرادب کے یہاں ایک طویل عرصے سے مستعمل ہیں اور ان اصطلاحات کو اہل ادب نے مجاز کی صورت میں استعمال کیا ہے۔ یہ ان کی مخصوص اصطلاحات ہیں اور ان کے مخصوص معنیٰ بھی۔ یہ الفاظ اس کثرت کے ساتھ اہل ادب کے یہاں رواج پا چکے ہیں کہ آج ہر ادبی کتاب سے بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ظاہر ہے ہر لفظ کا محل استعمال مختلف ہوتا ہے انھیں ساری باتوں کے پیش نظر میں نے اس مقالے میں اُنھیں اصطلاحی مفاہیم کے تحت نعت گوئی پر کیے گئے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ میں شرعاً اسے جائز نہیں سمجھتا تخلیق کا ایک لغوی معنیٰ ”طبع زادفن پارہ“ صاحب فیروز اللغات نے بتایا ہے اسی طرح تمیذ الرحمٰن کے معنیٰ ”خدا کا شاگرد“ اور مجازاً ”شاعر“ دیکھا جاسکتا ہے ظاہر ہے شرعاً ایسے الفاظ کے استعمال سے خود کو محفوظ رکھنا بہتر ہے:-

☆☆☆
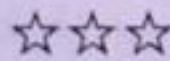
نعت گوئی کی موضوعاتی تفہیم اور تقسیم

اُردو ادب میں نعت گوئی کی مختلف صورتیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔اگر نعت کے ارتقائی تصور کو پیشِ نگاہ رکھیں اور اسکی معنویت کا جائزہ لیں جو ہر دور میں مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ فکری و موضوعاتی وسعت اختیار کرتی رہی ہے تو مذکورہ خانہ بندی سے خاطر خواہ نتائج برآمد کئے جاسکتے ہیں اس ضمن میں شاعر لکھنوی کے یہ جملے ہماری رہنمائی کرتے ہیں جو ایک لحاظ سے نعتیہ شاعری کو معنوی و جمالیاتی ساخت کے اعتبار سے دو بڑے حصے میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) وہ نعت جو روایت سے چل کر عقیدت پر ختم ہوتی ہے۔

(۲) وہ نعت جو عشق سے چل کر ایمان پر ختم ہوتی ہے۔

اگر نعت گوئی کے ارتقائی مراحل سے بات شروع کی جائے اور موضوعاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بلاشبہ توصیف کا نقطۂ آغاز ہی روایت بنتا ہے جسکی سبک روی عقیدت کی فضا کو ہموار کرتی ہوئی عشق کے ایوان میں داخل ہو کر ایمان کا برملا اعلان کرتی ہے۔لیکن روایت سے عقیدت اور عشق سے ایمان تک کا یہ سفر اس مقام پر پہنچ کر بالکل ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ ایک نئے سفر کا آغاز کرتا ہے جو عرفان اور وجدان کے صحراؤں پر انگلیوں سے نقشِ دوامی بنانے کی جدّوجہد میں مصروف دیکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا سے بیگانہ ہو کر بار بار بے خطر آتشِ نمرود میں کود کر گلزارِ خلیلی کی ٹھنڈک سے اپنی روحانی تسکین کرتا ہے یہ عرفانِ زندگی کو دائمی و آفاقی منزلوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ باتیں تو ایک رُخ کی مختلف جہتوں اور کیفیات کے سلسلے میں ہوئیں مگر اسکی دوسری جانب بھی بے حد دشوار مراحل ہیں مثلاً پہلا سوال یوں ہوتا ہے کہ روایت سے چل کر عقیدت تک پہنچنے والی نعتیں اپنے اندر تخلیقی اعتبار سے کس قسم کا مواد رکھتی ہیں اور اسکی نوعیت کیا ہے اسے مذہبی و ادبی سطح پر کون سا درجہ دیا جائے۔کیا اسکی حیثیت محض کلامِ منظوم کی ہوتی ہے جب کہ کسی بھی سطح کی نعتیں

ہوں اس میں مجموعی اعتبار سے ہماری مذہبی وملی پرچھائیاں ایک مخصوص فضا کی تشکیل کرتی ہیں۔ یوں بھی روایت سے کلی طور پر انحراف نعتیہ شاعری میں ممکن نہیں۔ جب یہ مرحلہ سامنے ہے تو درجات کے متعین کرنے کا تصور نہایت دشوار ضرور ہو جاتا ہے لیکن اسکے معنی یہ بھی نہیں کہ علامتوں اور خصوصیتوں کی روشنی میں درجات متعین نہ ہوسکیں۔ یوں بھی ادب اور مذہب کا عطا کردہ پیمانہ اتنا محدود نہیں جسکی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

دراصل ادب میں روایتی نعت ان فن پاروں کو قرار دیا گیا ہے جسکا دائرۂ فکر و معنی ایک خاص محور پر گردش کرتا ہو، جسے محض حصولِ برکات اور نیم ادبی وتہذیبی پاسداری میں موزوں کئے گئے ہوں جیسا کہ عام طور پر اردو شعراء بلاتفریقِ مذہب وملت اپنے دیوان کا آغاز حمد اور نعت کے اشعار سے کرتے تھے۔ اس مقام پر صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ہر مدّاحِ رسول کماحقہٗ احترام کا مستحق ہے جس نے روایت برائے تہذیب اس فن کو تاریخ کے دامن تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ہمیں بہرطور اس نقطہ کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ روایتی طرزِ سخن بھی نعت کے چند مخصوص گوشوں کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتی ہے جس سے عوام حد درجہ مانوس ہوتے ہیں، ان کے استعارے اور تشبیہات سادہ اور صاف ہوتے ہیں لہذا انکی خدمات کا جائزہ ہمیں روایتی طرز و اسلوب کے تحت لینا چاہئے۔ کیونکہ یہ اس بارگاہ مقدس سے اپنا رشتہ عقیدت استوار کئے ہوئے ہیں جہاں رحمت ہی رحمت ہے۔

ادب میں وہ نعتیں جو عشق سے چل کر ایمان وعرفان تک پہنچتی ہیں انکی عظمت ورفعت بہت ہمہ گیر اور پُروقار ہے جو تاریخ بھی بنتی ہیں اور تاریخی شعور بھی پیدا کرتی ہیں چونکہ ایسی نعتوں میں آفاقیت سمٹ جاتی ہے اور شعور وفکر، تدبّر وآگہی کی نورانی لہریں ذاتِ نبوّت ورسالت کے مقام اور عظمت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں مختلف زاویۂ فکر ونظر سے کام لیتی ہیں جو مدّاح کے وجودی عمل کو بے شمار منازل سے ہمکنار کر دیتی ہیں یہاں تک کہ مدّاح عرفان ووجدان کی جنت تک پہنچ جاتا ہے جہاں مجذوب اور سالک کی دو صورتیں رونما ہوتی ہیں۔ یہی وہ نعتیہ شاعری کا اجتہادی اسلوب ہے جسے محبوبِ کونین ﷺ کی خوشنودی کا درجۂ اعتبار حاصل ہوتا

ہے۔اگر اِس ارتقائے نعت کی مختلف سمتوں، جہتوں، نوعیتوں اور عظمتوں کو پیشِ نگاہ رکھیں تو یقینی طور پر ہمیں نعتیہ شاعری کی تقسیم اِس فکر کے تحت کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی کہ اسکی آفاقیت وہمہ گیریت سے خاطر خواہ واقف ہوسکیں اور اسکی ایک خاص وجہ یہ بھی ہیکہ فکری وفنی لوازمات کا احترام بطرز احسن اسی وقت کرسکتے ہیں جب موضوع کی عظمت کے شایانِ شان فنی وادبی یک جہتی ہو ورنہ موضوع کو صدمہ تو پہنچتا ہی ہے فنی لباس بھی چاک چاک ہوجاتا ہے۔

میں نے یہاں تک جو باتیں کہنے کی کوشش کی ہیں ان میں بعض منطقی سطح پر بڑی الجھن پیدا کرسکتی ہیں چونکہ جدید فکر ونظر رکھنے والے اظہار سے موضوع کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔انہیں کیا کہا گیا اس سے بحث نہیں بلکہ کیسے کہا گیا اِس سے بحث ہے۔اس سلسلے کی گفتگو آئندہ تفصیلی طور پر مثالوں کے ساتھ ہوگی۔یہاں مقالے کی طوالت دامن گیر ہے۔فی الحال موضوعاتی سطح پر فکروشعور کی نغمہ سرائی کے لئے چند دائرے قائم کررہا ہوں تاکہ نعت گوئی کے بیکراں موضوعات سے استفادہ کرنے میں آسانی ہو۔

(۱) **نعتِ اعتقادی** :- جہاں تک ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مخصوص نظریات کی بات ہے وہ اپنی جگہ،مگر نعت گوئی کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہئے کہ اس فن کا نظریہ ہمارے خودساختہ نظریوں سے کہیں بلند ہے۔نعت گوئی محض ایک فنِ ادب ہی نہیں بلکہ عبادت بھی ہے جس کی بنیاد قرآن وحدیث کے فرمان پر قائم ہے۔نعت گوئی میں عقیدے کا سلسلہ ایسا نظر نہیں آئیگا جو نظریہ بند شاعری میں دیکھا جاتا ہے۔یعنی جتنی نظر اتنا نظریہ۔لہذا نعت میں شرعی قوانین کو پیشِ نگاہ رکھ کر اپنے جذبوں کا اظہار کیا جاتا ہے جسے واضح طور پر ہم دوصورتوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

الف :- ایسی نعتیں جن میں رسولِ رحمت ﷺ کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے عقیدے کا اظہار کیا جائے اور وہی طرزِ فکر پیش کیا جائے جو سیرت کی ظاہری تصویر ہو۔

ب :- ایسی نعتیں جو قطعی ویقینی دلیلوں کو پکڑنے کے ساتھ اصحابِ رسول اور اولیائے امت کے خیالات وافکار کے تحت عظمتِ رسول اور مقامِ نبوّت کو بیان کرتی ہوں۔

(۲) **نعتِ عملی:-** اس سے مراد نعت گوئی کا وہ شعبہ ہے جہاں ذات و کائنات کو ایک ہمہ گیر اور لافانی ذاتِ اقدس سے عملی طور پر اپنی وابستگی کا اظہار کیا گیا ہو۔ اور جادۂ رحمت پر ثابت قدمی کے ساتھ خود بھی چلنے اور دوسروں کو راہِ حق قبول کرنے کی ہدایت ملتی ہو۔ لیکن اس ہدایت کا اظہار خالص خطابیہ نہ ہو بلکہ حکیمانہ طرز و اسلوب پر مبنی ہو۔

(۳) **نعتِ علمی:-** دبستانِ نعت میں علمی نعت اسے قرار دیا جاسکتا ہے جن میں قرآن وحدیث اور عقائدِ اسلامی سے براہِ راست استدلال کئے گئے ہوں اور جدید خیالات ونظریات کو شعورِ اسلامی سے آشنا کرنے کا ایک باوقار رجحان ومیلان ملتا ہو۔ جہاں کارِ جہاں بانی وکارِ جہاں بینی کے سارے جذبات سیرت رسول، احکاماتِ رسول سے نہایت فکری انداز سے پیش کئے گئے ہوں۔ ظاہر ہے ایسی نعتوں میں مداح نے کن تدبیروں سے کام لیا ہے اور عصری تقاضے کیا تھے ان تمام گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

مندرجہ بالا قسمیں جو بیان کی گئی ہیں۔ انھیں الگ الگ کرنا بڑا دشوار ہے۔ کیونکہ ان تینوں کا سفر کم وبیش ایک ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن نعتِ اعتقادی ہی بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ عقیدے کی زمین پر ہی فکر وفن کی تعمیر ہوتی ہے جو عملی اور علمی صورتوں میں سامنے آتی ہیں۔ اب نعت کے اعتقادی افکار ہمیں قرآن وحدیث سے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں شریعتِ اسلامیہ ہماری رہنمائی کرتی ہے اس باب میں وحدانیت ورسالت اور عبودیت ومحبوبیت کے درمیان جو فرق وامتیاز ہیں ان کی واضح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نعتِ اعتقادی کے ذریعہ ایک نبی اور ایک امتی کی وابستگی کا معیار شعری پیکر میں ادبیاتِ عالیہ کا انمول حصہ قرار پاتا ہے۔ نعتِ اعتقادی تخلیقی عمل کے لئے متصوفانہ عرفان ووجدان سے ایک حد تک فیض حاصل ضرور کرتی ہے لیکن باقاعدہ علمِ عقائد اور علمِ فقہ سے کسبِ نور بھی کرتی ہے۔ اُردو ادب میں نعتیہ ادب کا سرمایہ اس قدر ہے کہ دوسرے اصنافِ سخن میں کسی صنف کا اتنا ذخیرہ شاید ہی موجود ہو۔ تاریخ کے ہر دور میں مداحانِ رسالت نے اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ بعض علماء وصوفیا اور شعراء نے موضوعات کی بے پناہ وسعت کے پیشِ نظر باقاعدہ ''یک موضوعی'' انداز اپنائے اور ایک مربوط نظم کی طرح ایک ہی موضوع اور عنوان کے تحت فکری

تسلسل کا اسلوب عطا کیا۔ جنھیں چار صورتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جسے ہم اردو کے ابتدائی دور میں دکنی ادب کی تاریخ میں دیکھتے ہیں۔

(۱) مولود نامہ یا میلاد نامہ (۲) معراج نامہ (۳) نور نامہ (۴) درود وسلام

(۱) **مولود نامہ یا میلاد نامہ:-** سرکارِ دو جہاں ﷺ کے وجودِ مبارکہ سے متعلق علمائے کرام نے تین مراحل بیان کئے ہیں جن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو میلاد ناموں کی وسعت کا اندازہ محال نہیں اس سلسلے میں مولانا ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی کتاب ''جشن میلاد النبی کی شرعی حیثیت'' سے ایک اقتباس کچھ ضروری ترمیم کے ساتھ درج کر رہا ہوں۔

''سرکارِ دو جہاں ﷺ کا وجودِ مبارک اپنے ظہور کے اعتبار سے تین مختلف مراحل سے گزرا۔ پہلا مرحلہ :- حضور کی خلقت کا ہے اور خلقتِ محمدی ﷺ سے مراد وجودِ مصطفوی کے اس ظہورِ اول کا مرحلہ ہے جب وجودِ نبوی کو اللہ تعالیٰ نے عالمِ عدم سے عالمِ وجود میں منتقل فرمایا۔

دوسرا مرحلہ :- حضور سید الکونین ﷺ کا نور مبارک حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی پُشت اطہر سے حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے شکم مبارک میں منتقل ہونا ہے۔ محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ'' جاننا چاہئے کہ استقرار نطفۂ زکیۂ مصطفوی وابداع ذرۂ محمدی در صدف رحم آمنہ رضی اللہ عنہا قول اصح کے بموجب ایام حج کے درمیانی تشریق کی شب جمعہ میں ہوا تھا۔ اسی بنا پر حضرت امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شب جمعہ لیلۃ القدر سے افضل ہے۔ اس لئے کہ اس رات سارے جہان اور تمام مسلمانوں پر ہر قسم کی خیر و برکت اور سعادت وکرامت جس قدر نازل ہوئی اتنی قیامت تک کسی رات میں نہ ہوگی بلکہ تا ابد کبھی نازل نہ ہوگی''۔

تیسرا مرحلہ :- حضور ﷺ کی ولادت کا جو ائمۂ متقدمین ومتاخرین کی اکثریت کی رائے کے مطابق ۱۲ ربیع الاول کا دن ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ظہورِ قدسی کی برکتوں سے عالمِ انسانیت پر اپنی رحمتِ کاملہ کا اظہار فرمایا اور شہرِ مکہ کی فضاؤں کو رشکِ جنتِ فردوس بنا دیا۔''

میلاد نامہ کی روایت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ اِس نظم میں شعراء حضور سید

کائنات ﷺ تینوں مراحل کے مخصوص گوشوں کا ذکر کرتے ہیں۔اس نظم میں عہدِ رسالت سے قبل کی تاریخ بیان کی جاتی ہے اور ضلالت و گمرہی، قبائل پرستی، انسانیت سوز حالات، جنگ و جدال اور کفر و شرک کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔اسکے بعد حضور ﷺ کی خلقت، ولادت اور بعثت کے حقائق و واقعات کی روشنی میں اپنے جذبات و افکار کو مؤثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں خداوند قدوس کی سب سے عظیم نعمت کا والہانہ استقبال جلیل القدر انبیاء و مرسلین کی بشارتوں اور دنیائے آب و گل میں نور و رحمت کی بارشوں اور حیات و کائنات میں سب سے عظیم انقلاب کے تصورات و افکار کو محسن انسانیت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

میلاد ناموں کا لکھنا اگر دشوار ہے تو ایک حد تک آسان بھی ہے۔اس میں واقعات و حالات کو تاریخی شعور کے تحت بیانیہ خطابیہ اور طربیہ طرزِ سخن میں بیان کیا جاتا ہے۔میلاد نامے اردو میں کافی تعداد میں لکھے گئے ہیں۔بعض شعراء نے میلاد نامہ مختلف عنوان کے تحت لکھا ہے جیسے ظہورِ قدسی، جشن عید میلاد النبی، بعثتِ نبی ﷺ۔

بعض محققین کے نزدیک اردو زبان میں میلاد پر سب سے پہلی کتاب گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں ''مولود'' سامنے آئی اسکا مصنف دکنی شاعر فتاحی تھا۔یہ مولود کی پہلی کتاب اپنے طرز اور اندازِ بیان میں منفرد تھی۔چنانچہ اسکی مقبولیت کے ساتھ ہی اردو میں میلاد ناموں کا سلسلہ چل پڑا۔مختار (ہمعصر فتاحی) کا میلاد نامہ بھی ابتدائی میلاد ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

چند معروف میلاد ناموں کی مختصر فہرست حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مولود شہیدی......غلام احمد شہید آبادی (۲) مولود سعیدی......محمد علی خان سعید لکھنوی

(۳) مولود رسول......مولوی حفیظ اللہ بندہ بدایونی (۴) مولود اکبر......خواجہ محمد اکبر خان اکبر وارثی

(۵) مولود منظوم......شاہ فضل الرسول قادری مست (۶) میلاد نامہ......خواجہ حسن نظامی

(۷) میلاد مقبول......کیف المسلمی امروہوی (۸) میلاد گوہر......منشی گوہر علی خاں گوہر رامپوری

(۲) **معراج نامہ** :- معراج کا واقعہ بھی نعتیہ شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔عربی،

فارسی اور اردو شاعری میں معراج النبی کا ذکر بڑی کثرت سے ملتا ہے۔اردو کے شعرائے قدیم وجدید کے کلام میں واقعۂ معراج کو مختلف فکری، وجدانی، شعوری اور واقعاتی رویوں اور رنگوں کے ساتھ مختلف اسالیب وہیأت میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔اردو کے قدیم شعراء نے معراج نامہ کے نام سے مربوط اور مسلسل نظمیں لکھی ہیں خاص طور پر مثنوی اور قصیدے کے فارم میں بیشتر معراج نامے نظر آتے ہیں۔بعض اربابِ تحقیق کے نزدیک اردو میں پہلا معراج نامہ سید میراں ہاشمی (دکن) کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہے بعد ازاں متعدد معراج نامے لکھے گئے۔ان میں ہاشم بیجاپوری اعظم دکنی مجتبیٰ مہدی، شاہ کمال الدین، سید بلاقی حیدر آبادی، معظم بیجاپوری، مختار نصرتی، ولی ویلوری، لچھمی نرائن شفق، شاہ ابوالحسن قربی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔شمالی ہند میں جو معراج نامے مثنوی کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں وہ بھی بڑی تعداد میں ہیں۔مثلاً

(۱) حقائق معراج......میر قدرت اللہ قاسم (۲) ریحانِ معراج......میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی

(۳) لیلۃ الاسریٰ......اطہر ہاپوڑی (۴) نظم معراج......علی احمد خاں اسیر بدایونی،

اردو میں مولانا شاہ احمد رضا بریلوی کا معراج نامہ، حضور محدث اعظم ہند سید محمد کچھوچھوی اور مولانا محسن کاکوروی کا قصیدۂ معراجیہ ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' ہندوستانی تہذیب وتمدن کے زیرِ اثر لکھے گئے ہیں۔جو اپنی مثال نہیں رکھتے۔فاضلِ بریلوی امام احمد رضا کا قصیدۂ معراجیہ ''تہنیتِ شادیٔ اسرا'' اردو معراج ناموں میں ایک اہم معراجیہ قصیدہ ہے اِس قصیدے کی فضا اور رنگ وآہنگ روایتی معراج ناموں سے بالکل جدا ہے۔اِس سلسلے میں باقاعدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔فی الحال محض تذکرہ کافی ہے۔معراج نامہ لکھنا بہت دشوار کام ہے۔کیونکہ ماورائی واقعات وحالات کو جامۂ اظہار عطا کرنا بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔اس مقام پر طائرِ تخیّل کی قوت کہاں کہ لامکانی فضا میں محبوب ومحبّ کے جلوؤں کو دیکھ سکے۔یہاں تو طائرِ سدرہ کے بال وپر بھی جلنے کا خدشہ ہے۔دراصل معراج نامے لکھنے کے لئے شعوری طور پر معراج کی مکمل تفصیلات کا ازبر ہونا نہایت ضروری ہے اس کے علاوہ واقعات نگاری میں تسلسل اور جاذبیت ہو، زبان وبیان پر قدرت حاصل ہو، وحدانیت ورسالت کے افتراق کا حقیقی تصور ہو اور تمام جزیات پر نگاہ ہو تو پھر

معراج نامہ لکھنے کی کوشش کرے ورنہ مداح کو ناکامی کا منھ دیکھنا لازمی ہے۔شاید اسی سبب سے شعری وشرعی معراج ناموں کی مثالیں دو چار سے زیادہ نہیں۔مگر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے منفرد فکری زاویوں سے کام لیتے ہوئے غزل کے فارم میں جستہ جستہ خیال کی خوبصورت مثالیں بے شمار نظر آتی ہیں۔

(۳) **نور نامہ**:- اردو نعتیہ شاعری میں نور نامہ لکھنے کی بھی قدیم روایت نظر آتی ہے۔کون ایسا شاعر ہوگا جس نے نعت میں حضور سیدِ کائنات نور مجسم ﷺ کی نورانیت کا ذکر نہ کیا ہو۔قرآن وحدیث میں حضور کی نورانیت کے بے شمار شواہد موجود ہیں مثلاً قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے ”قد جاء کم من اللہ نور وکتاب مبین“ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک نور آیا اور ایک روشن کتاب آئی ، اِس آیتِ مقدسہ میں نور سے مراد نور مجسم نیّرِ اعظم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے اور کتاب سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔

نعت گو شعراء نے خاص طور پر اِس موضوع کو مختلف انداز واسالیب میں پیش کیا ہے اردو میں بصورتِ قصیدہ ایک ایمان افروز نور نامہ حضرت فاضل بریلوی کا نظر آتا ہے جو ہر لحاظ سے لاجواب ہے۔ان کے علاوہ بے شمار شعراء نے مختلف ہیئتوں میں نور نامے لکھے ہیں۔یوں تو متفرقات میں فکروشعور کی ہزاروں شمع جگمگاتی نظر آتی ہیں۔چونکہ نور نامہ اس طویل اور مربوط نظم کو کہتے ہیں جسمیں ابتدائے کلام سے اختتامِ کلام تک صرف نور محمدی ﷺ کی نورانیت وفضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۴) **سلام**:- نعت گوئی کے باب میں نبیٔ دوجہاں ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں درودوسلام کے موضوع کو جو مقام ومنزلت حاصل ہے وہ اہلِ ایمان سے پوشیدہ نہیں۔درودوسلام کی ہدایت قرآنِ عظیم میں ارشاد ہے ”بے شک اللہ اور اسکے فرشتے نبی کریم ﷺ پر درودوسلام بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درودوسلام خوب کثرت سے بھیجو۔“

اس فرمانِ مقدسہ کے تحت درودوسلام اہل ایمان کا وظیفہ بن گیا۔اور ایک مستقل باب نعتیہ شعروادب میں قائم ہوا۔عربی نعتیہ شاعری میں امام زین العابدین ؓ کا سلام جسمیں سوزوگداز کی ایسی

کیفیت ہے کہ تاریخ میں مثال نہیں ۔فارسی اور اردو میں بے شمار نعتیہ سلام مختلف رنگ و آہنگ اور اسلوب وساخت میں لکھے گئے ہیں ۔شبلی نعمانی رقم طراز ہیں ''اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہے اور اقسامِ سخن میں اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا لیکن غزل کی لَے اس قدر کانوں میں رچ بس چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اِس بناء پر انھوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔سلام کی بحریں غزل والی ہوتی ہیں ۔غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ ،نئی بندش، سادہ اور صاف، مضمون دردانگیز ہوتا ہے۔'' (موازنۂ انیس و دبیر۔ص ۲۶۱)

مولانا شبلی نعمانی نے جس سلام کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ مراثی ادب سے تعلق رکھتا ہے نعتیہ ادب کا سلام مضمون اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے ۔اِس کے مضامین بھی نعتیہ شاعری کی طرح قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں ۔جس میں مداحانِ رسول اپنی ایمانی کیفیات کو سمو کر گلدستۂ درود وسلام بنا کر نہایت عجز وانکسار کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں پیش کیا کرتے ہیں ۔اردو میں یوں تو بے شمار سلام لکھے گئے ہیں ۔ان میں جن سلاموں کو بے پناہ مقبولیت ملی ان میں ''امام احمد رضا خاں بریلوی کا سلام " مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام' اور شاہ اکبر وارثی کے بعد حفیظ جالندھری، ماہر القادری اور جمیل قادری بریلوی کے سلام نمایاں مقام رکھتے ہیں موجودہ دور میں جدید شعراء نے جدید ہیئتوں میں سلام لکھ کر اپنے ایمانی جذبے کا خوبصورت اظہار کیا ہے۔(اِس مضمون میں محض اشارہ ہی کیا گیا ہے)

(۵) **منظوم سیرتِ رسول** :- نعتیہ ادب میں منظوم سیرتِ رسول بھی خاصی تعداد میں نظر آتی ہیں اردو شعراء نے عشقِ رسول کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنی بخشش ونجات کا ایک انمول ذریعہ منظوم سیرتِ رسول کو سمجھا اور قدیم زمانے ہی سے مختلف نام سے سیرت کو منظوم کیا ہے جن میں (۱) شمائلِ نبوی...... عبدالحمید ترین (۲) روضۃ الانوار...... میر فیاض علی وَلی ویلوری (۳) سیرتِ پاک منظوم...... سعد الدین سعد عثمانی (۴) بہارِ سیرت...... محمد علی خان شاہین اشرف (۵) معجزۂ

نبوی......علی احمد خان اسیر بدایونی (۶) نظام الشہود (متعلقہ ولادت)

مندرجہ بالا پانچ صورتیں نعتیہ شاعری میں بے حد اہمیت کی حامل ہیں جنھیں ہم نعتیہ شاعری کا اہم ترین سرمایہ تصور کرتے ہیں۔ اِس یک موضوعاتی نظام میں مختلف موضوعات ایک دوسرے سے کہیں کہیں حد درجہ ہم آہنگ بھی نظر آتے ہیں اور کہیں انفرادی تصور کے تحت دیکھے جاتے ہیں۔اس کے باوجود اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو بہر صورت نعتیہ موضوعات کے اظہار و بیان اسلوب و ہیئت اور ساخت کے پیشِ نظر کسی ایک موضوع کو اسکے مخصوص دائرے کے اندر فکر وفن کی کاوشوں کو ایک باضابطہ صنف کی حیثیت سے ضرور دیکھ سکتے ہیں جس کی طرف اصحابِ ادب نے توجہ نہیں دی۔ جب مرثیہ کو مسدس کی ہیئت میں اہلِ نقد ونظر نے مختص کر دیا تو سلام کی صنف کو بعد کے شعراء نے ایجاد کیا جن کا طبعی میلان غزل کی جانب تھا اور اسے تسلیم بھی کر لیا گیا۔اس صورت میں کیا ہم نعت کے بیکراں موضوعات سے بعض گوشوں کی ترجمانی کے لئے کسی نئی صنف کا احیا نہیں کر سکتے ؟ ہمارے ناقدین نے ہمیشہ یہی کہا کہ نعت کا موضوع بے حد وسعت رکھتا ہے اگر دنیا کے سارے قلم کار اس موضوع کو پیش کرنا چاہیں تو بہر صورت اس کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے۔اس خیال کی صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔لیکن فکری وادبی تقاضے تو ہر عہد میں قلمکاروں کو ایجاد واختراع کی دنیا میں لاتے ہیں۔موجودہ عہد ہیئتی انقلاب سے گزر رہا ہے۔نئے نئے انکشافات وتجربات ہو رہے ہیں۔اس بحث کو ہم آئندہ سطروں میں جاری رکھیں گے۔فی الحال چند دائرے قائم کرتا ہوں تاکہ اس بحث کو مزید آگے بڑھائی جاسکے۔

(۱) **مدحیہ نعت** :- مدحیہ نعت میں ممدوحِ کبریاﷺ کی سیرتِ مقدس کے ان گوشوں کی ترجمانی ہوتی ہے جو کمالاتِ نبوی اور صفاتِ رسالت سے متصف ہوتے ہیں۔ظاہر ہے اس طرزِ سخن میں تعریف وتوصیف کے رنگ وآہنگ قصیدے کی صورت میں نظر آئینگے۔

(۲) **واصفانہ نعت** :- واصفانہ نعت میں حضورﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا اظہار اگر روایتی طرز میں سامنے آئے تو اس طرح کے منظومات کو واصفانہ نعت سے موسوم کرتے ہیں۔

(۳) **عاشقانہ نعت** :- عاشقانہ نعت سے مراد ایسی نعتیں ہیں جن میں عشق ومحبت کے جذبات غالب ہوں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ ایک لہر ہے ایک موج ہے جو عاشق کو بے نشان منزلِ رحمت کی جانب لے جارہی ہے۔ حضور ﷺ کی ذات وشخصیت وہ آئینہ ہے جسکی سطح پر رب العلمین کے جلال و جمال واضح طور پر منعکس ہوں۔ تکلفات، معاملہ بندی، انانیت کا شائبہ اِس رنگِ سخن پر اثر انداز نہ ہو۔

(۴) **عارفانہ نعت** :- عارفانہ نعت کا تخلیقی مزاج متصوفانہ رنگ وآہنگ سے منسلک ہوتا ہے۔ کیونکہ فنافی الرسول کی منزل درحقیقت اسے کہتے ہیں جو قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے شعور وفکر کو اس منتہا تک پہنچادے جہاں عظمتِ رسالت کی تجلیاں جگمگاتی ہیں۔ عشقِ رسول کے ذریعہ ذاتی طور پر ادراک وعرفان جو حاصل ہوتے ہیں ان میں شیفتگی وسپردگی کا جلوہ بھی پنہاں ہوتا ہے۔ عارفانہ نعتیں محبوب ومحبّ میں میرا اور تیرا کا تصور نہیں رکھتی ہیں مگر اعتقادی سطح پر وحدانیت و رسالت کے امتیازات کی پاسداری کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

(۵) **خطابیہ نعت** :- اس میں پند ونصیحت کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ سیرتِ رسول اور تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں نیکی، پاکیزگی اور ایمانداری کی تلقین کی جاتی ہے۔ برائیوں سے پرہیز اور اچھائیوں پر عمل کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے۔ خطابیہ نعتوں میں مضامین باہر سے نہیں لائے جاتے بلکہ سیرتِ مصطفےٰ کی روشنی میں ہی ساری باتیں ناصحانہ انداز میں بیان کی جاتی ہیں۔ جس کا رنگ وآہنگ اور طرز وانداز خود کلامی بھی ہوسکتا ہے اور ناصحانہ بھی اس سے اثر وتاثیر میں شدت اور خلوص ومحبت کا رنگ نکھرتا ہے۔

(۶) **رزمیہ نعت** :- رزمیہ نعت سے مراد ایسی نعت ہے جس میں سیدِ عالم ﷺ کے مخالفوں اور بدگویوں کی روش پر تنقید کی جائے۔ انکے باطل نظریات وخیالات اور کردار واطوار کا مجاہدانہ انداز میں محاسبہ کیا جائے۔ اندازِ بیان کاٹ دار اور تہ دار ہو، زبان چست اور صاف ہو۔

(۷) **فخریہ نعت** :- ایمان وعرفان کی شرف یابی کا اظہار تحدیثِ نعمت کے طور پر

مومنانہ شان وشوکت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اگر دربارِ نبوّت کی جانب روئے سخن ہو تو زبان و بیان میں عجز وانکسار کا ہونا لازمی ہے اگر اہل دنیا کی جانب اشارہ مقصود ہو تو زبان و بیان پر شکوہ ہوں۔

(۸) جمالیاتی نعت :- جمالیاتی نعت سے مراد ایسی نعتیں ہیں جن میں حسنِ مجازی وحسنِ حقیقی کا ایک امتزاج نظر آئے۔ لیکن محبوب ومحبّ کے تصور میں حقیقت اور مجاز کے درمیان ایک لطیف سا فاصلہ اور اس فاصلے میں مظہریتِ کبریٰ کا جلوہ پنہاں ہوتا کہ محبوبیت کے تصور کو صدمہ نہ پہنچے اس اہتمام والتزام سے ممدوح نگار کی نگاہوں میں حسن کی تصویر نکھر کر آتی ہے اور عشق ومحبت ہر زاویہ سے جھلک پڑتے ہیں۔ یہ امور اس انداز سے نظم ہوں کہ حُسنِ الفاظ اور حسنِ معنیٰ منظر بہ منظر ہمارے لئے فکر وشعور کی ایک نئی معنویت کا در کھولتے ہوں۔

(۹) قدیم وجدید نعت میں فرق :-

(۱) اردو قدیم نعت گوئی پر تہذیبی وملّی طور پر معاشرتی روایت جو خالص ہندی تھی ان میں بھجن اور گیتوں کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جدید نعت میں عربی اور فارسی تہذیب کے اثرات نمایاں ہیں۔ (۲) اوائلِ نعتیہ شاعری میں رسولِ کریم ﷺ کی مدحت عشقیہ انداز سے کی جاتی تھی جس میں حضور ﷺ کی زلفیں، قدِ مبارک، اندازِ گفتگو، حُسنِ سراپا وغیرہ کو بہت خوبصورت انداز سے بیان کیا جاتا تھا۔ جدید نعت میں حالؔی سے اقبالؔ اور موجودہ دور تک آپ کی تعلیمات اور انسان دوستی کو خاص طور پر نمایاں انداز میں بیان کیا جارہا ہے۔

(۳) جدید نعت کے فروغ کا ایک خاص اسلوب متصوفانہ رنگ وآہنگ میں نظر آتا ہے۔ جن میں محسن کاکوروی، امیر مینائی، اصغر گونڈوی، آسی سکندر پوری، بیدم وارثی، جمیل بدایونی، مصطفےٰ رضا نوری بریلوی، محدّثِ اعظم کچھوچھوی، صدر الافاضل نعیم الدین مرادآبادی کی خدماتِ جلیلہ ایک مخصوص روایت بنکر جدید نعت کے فروغ کا باعث ہوئیں۔

(۴) جدید نعت میں اسلوب کا فروغ اقبالؔ وحالؔی کے ذریعہ ہوا بالخصوص مسدسِ حالؔی میں جن اسالیب سے کام لیا گیا ہے وہ اسالیب جدید نعتوں میں بہت نمایاں ہیں۔ حالؔی کے سلیس رواں دواں

اور پُر اثر لہجے کو عصرِ حاضر کے شعراء نے برتا ہے۔ زائرِ حرم حمید صدیقی، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، حفیظ جالندھری، ضیاء القادری، ظفر علی خاں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس تسلسل کو حفیظ تائب، مظفر وارثی وغیرہ کے ذریعے فروغ مل رہا ہے۔

جدید اسلوب کا دوسرا مکتب فکر ڈاکٹر اقبال اور امام احمد رضا بریلوی سے متاثر ہوا۔ جن میں جعفر طاہر، عبد العزیز خالد، کوثر جائسی، مظفر وارثی، حق بنارسی، نظمی مارہروی، محشر رسول نگری، اجمل سلطان پوری، بیکل اتساہی، قاسم حبیبی برکاتی، میکائیل ضیائی، کے علاوہ اور بھی نام پیش کئے جاسکتے ہیں۔

(۵) جدید نعت میں ہیئتی تجربے اور جدید تر اسالیب کی مثالیں شبنم رومانی، محشر بدایونی، نعیم صدّیقی، نظیر قیصر، خالد غزنوی، نسیم سحر، شہزاد احمد، ریاض حسین چودھری، احمد ندیم قاسمی، جعفر طاہر، ظہور نظر، اطہر نفیس، سلیم کوثر، صلاح الدین پرویزؔ، عمیقؔ حنفی، زیب غوری، طلحہ رضوی برق، اشتیاق عالم ضیاء شہبازی، وغیرہ نمایاں ہیں۔ اور تازہ کار نعت گو شعراء میں اجمل نقشبندی، قدسی بھدرکی، علیم صبا نویدی، وغیرہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

(۶) جدید نعت میں جمالیاتی قدریں مولانا احمد رضاؔ، محسنؔ کاکوروی، حسن رضا بریلوی، حسرتؔ موہانی، سیمابؔ اکبر آبادی وغیرہ سے ہوتی ہوئی موجودہ عہد تک پہنچی ہیں۔ اس روایت کو جدید تر اسلوب و آہنگ عطا کرنے والے بہت سے نام پیش کئے جاسکتے ہیں مثلاً آصفؔ طاہری، یاورؔ وارثی وغیرہ جن کا سفر ابھی جاری ہے اور اپنی شناخت بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ نیم جدید اسالیبِ نعت کے شعرا کا شمار مشکل ہے (یہ محض سرسری جائزہ ہے)

(۷) مناسب ہوگا کہ اس ضمن میں ایک ناقد کے خیال سے استفادہ کرتا چلوں۔ ''قدیم نعت کے موضوعات حضور اکرم ﷺ کے جمال صوری سے توانائی پاکر متعین کئے جاتے تھے۔ آپ کی ذات والا صفات سے عقیدت اور مدینے پہنچنے کی تمنا بھی نعت کا محرک ہوتی تھیں۔ جدید نعت میں موضوعات کی وسعت اور تنوع دیدنی ہے۔ اب نعت میں روح عصر (Zeitgeist) اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح زندہ ادب میں ہونی چاہئے

(اردو نعت اور جدید اسالیب عزیز احسن ،نعت رنگ)

مندرجہ بالا اقسام جو بیان کی گئی ہیں انھیں دراصل نعتیہ شاعری کی مختلف سمتوں ، جہتوں اور نوعیتوں کی روشنی میں ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہیں۔اس خیال کو بھی پیشِ نگاہ رکھ کر معروضات بیان کئے گئے ہیں جسے نعت کا ارتقا کہتے ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ جب نعت گوئی کو ایک باضابطہ صنف کا درجہ مل چکا ہے تو مندرجہ بالا تقسیم سے کیا حاصل؟ دراصل نعت گوئی کی اتنی جہتیں اور سمتیں ہیں جو فکر وسخن کے لئے ہمیشہ راہیں کشادہ رکھتی ہیں۔

ابھی تک تو ہم محض اردو زبان میں لکھی ہوئی نعتوں کا عظیم ترین سرمایہ سمیٹنے میں ناکام ہیں اور جدید عہد کے جدید تقاضے ہمیں آواز دے رہے ہیں جہاں ہمارے پاس ماضی کا سرمایہ ہونا از حد ضروری ہو جاتا ہے ورنہ حال اور مستقبل کیلئے ہمارا وجود بے معنی ہو جائیگا کیوں کہ نعت گوئی ہمیں ہر حال میں اپنے مرکز ومحور کے دائرے میں رکھکر ہمارے وجود کو بے معنویت سے بچاتی ہے دنیا کو اس کا احساس ہو نہ ہو ایک مومن کو اس کا ادراک ضرور ہوگا۔۱۹۹۸ (نگاہِ یارسول اللہ نگاہ)

نعت گوئی کے اصول

علمائے شعر وادب نے نعت گوئی کی سنگلاخی اور دشواری کے سلسلے میں ہمیشہ اظہار رائے کیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی معزز شخصیت کی تعریف وتوصیف شاعرانہ لوازمات کے ساتھ کرنا کوئی مشکل کام نہیں مگر ممدوحِ کبریا ﷺ کی مدح میں اشعار کا موزوں کر لینا بلا مبالغہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے کیونکہ نعت خداوندِ کریم کی محبوب ترین سنت ہے جس کے لئے مضامین قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں اور اُنھیں اسلوب کی دلکشی وزیبائش کے ساتھ حُسنِ ایمان کے تحت جامۂ اظہار عطا کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ذاتِ گرامی ہے جس کی مدح سرائی میں بڑے بڑے تاجورانِ سخن اپنی قادرالکلامی کے باوجود لرزیدہ و ترسیدہ نظر آتے ہیں۔ عرفی شیرازی جیسا باکمال شاعر بھی نعت کی اس مقدس راہ کو ''بردمِ تیغ'' ہی تصور کرتا ہے۔ مثلاً

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

د ر ا صـــــــل نعت گوئی کی منزل وہ منزل ہے جہاں ایک مداحِ رسول کو الوہیت ورسالت کی حدود شناسی اور عبودیت ومحبوبیت کے نازک ترین رموز کا عرفان ہونا لازمی ہے۔ اس مقام پر جذبات واحساسات میں حد درجہ توازن واعتدال اور افکار ونظریات میں بے پناہ پاکیزگی وطہارت کی شدید ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ " باخدا دیوانہ باش وبا محمد ہوشیار " کی دشوار گزار منزل کے تقاضے ایک مداح کو سب سے پہلے خدا شناسی محبوب شناسی اور ادب شناسی جیسے امور کی راہ دکھاتے ہیں اور ساتھ ہی اس سے شیفتگی وسپردگی کے رنگ وآہنگ کا مطالبہ بھی کرتے ہیں جو عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول کی رعنائیوں سے فکر ومعنیٰ کے ایک جہان کو تابناک کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر اس عظیم بارگاہ میں حاضر ہونے والا اپنی سانسیں تک روک لیتا ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر　　نفس گم کردہ می آید جنید وبایزید ایں جا

چونکہ اس محبوب شناس منظر نامے میں جہاں عشقِ رسول کا والہانہ اظہار پنہاں ہے وہیں وحدت کا ایک ایسا جمالیاتی تصوّر بھی کارفرما ہے۔ جو بیک وقت محبوب و محبّ کے جلووں سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ جسے ایک مداحِ رسول شعوری فضا میں دیکھتا ہے اور اسکے بعد عرفان و آگہی کے چشمے کی باریک لہروں کو فکر و نظر کے ذریعہ جامۂ اظہار بخشنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی نعتیہ شاعری کی باطنی اور داخلی فضا ہے جہاں مداح کو رسالت کی حقیقی نوعیت کا عرفان ہونے لگتا ہے اور رموز و اسرار کے نئے نئے باب کھلنے لگتے ہیں پھر وہ عاشق رسول علامہ عبدالرحمٰن جامی علیہ الرحمہ کی زبان میں بے ساختہ یوں پکار اٹھتا ہے۔

يَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَيَا سَيِّدَالْبَشَرْ
مِنْ وَّجْهِكَ الْمُنِيْرِ لَقَدْ نُوِّرَالْقَمَرْ
لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقَّهٗ
بَعْدَ اَزْ خُدَا بُزُرْگ تُوْئِیْ قِصَّہ مُخْتَصَرْ

نعت کے داخلی نظامِ فکر و شعور میں جب مصطفےٰ جانِ رحمت ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات کا منظر نامہ ایک مداحِ رسول کی نگاہوں کی طہارت کا ذریعہ بنتا ہے اور اسے ایمان و عشق کی شیفتگی و بالیدگی حاصل ہو جاتی ہے تو اس مرکزی ذات کی آفاقیت و ہمہ گیریت کے حوالے اور وسیلے سے جمالِ خدا، جلالِ کبریا، اسرارِ خودی، عشق و عقل کی بصیرت، حکمت و دانائی، فلسفۂ حیات و کائنات، تصورِ آگہی و بندگی، دین کی آفاقیت، دنیا کی بے ثباتی، مادہ اور روح کے حقائق، نجات و انعام کا اخروی تصور، سادگی و حسن، اخلاق و شرافت اور کمالِ انسانیت کا دائمی تصور وغیرہ، جیسے بے شمار فکری و معنوی جہتیں کھل جاتی ہیں۔ لیکن نعت میں اظہارِ بیان میں بھی، اصولِ شرعیہ کے احکامات کو مکمل طور پر برقرار رکھے جاتے ہیں۔ ہر ایک مقام پر وحدانیت و رسالت میں امتیاز باقی رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ قربت اور محبوبیت کی حقیقی نوعیت و عظمت بھی موجود رہتی ہے۔

ایسی صورت میں مداح اظہارِ عجز یوں بیان کرتا ہے۔

حق جلوہ گر زطرزِ بیان محمد است   آرد کلام حق بہ زبانِ محمد است

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم   کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

یہی وہ دشواریاں ہیں۔ جن کے پیشِ نظر اکثر شعراء صنفِ نعت میں طبع آزمائی سے خوف کھاتے ہیں۔ کیونکہ مدحت مصطفٰے ﷺ کے اظہار میں ذرّہ برابر چوک عذابِ الٰہی کا مرتکب کر سکتی ہے۔ چونکہ سیرتِ مصطفٰے کی جامعیت کا اظہار اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے اعتبار سے یوں بھی کوئی شخصی سیرت نہیں بلکہ ایک عالمگیر دستورِ حیات ہے جس میں نوعِ انسان کی ارتقائی زندگی کی تمام نزاکتیں موجود ہیں جو تمام انسانی قدروں کی ترتیب و اصلاح بھی کرتی ہیں اور انھیں علوم و معارف کے ذریعہ آسودہ بھی کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے جب اس قدر تہہ دار اور بامعنیٰ زندگی کا تصور سامنے آئے گا تو کس کی مجال ہے کہ انھیں مکمل طور پر احاطۂ فکر و اظہار میں لانے کی جرأت کر سکے

اردو ادب میں بعض عظیم المرتبت شعراء ایسے بھی گزرے ہیں۔ جو نعت گوئی کے رموز و اسرار سے واقف ہی نہیں بلکہ اسکا حقیقی علم و شعور رکھتے ہیں اور جنھوں نے صنفِ نعت کو مکمل شرعی اور شعری اصول و ضوابط کے ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت سے فروغ بخشا اور اس سعادتِ ابدی کو عبادت سے تعبیر کیا۔ ان میں ایک نام اعلیٰ حضرت امام احمد رضاؔ خاں فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ کا ہے جو بیحد احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے انھوں نے جو ایک عالمِ شریعت و معرفت کی حیثیت سے اس دشوار گزار راستے پر سبک خرامی کے لئے بڑا ہی انوکھا نظریہ نعت گوئی پیش فرمایا کہ

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ   بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی   یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان نے مدحت نگارانِ مصطفٰے کو قرآنِ پاک سے نعت گوئی سیکھنے کا مزاج عطا فرمایا اور مکمل احکامِ شریعت کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا۔ اسی کے ساتھ آپ نے شعری لوازمات کی تسکین کے لئے بارگاہِ رسالت مآب کے مقبول و محبوب شاعر حضرت حسان ابنِ ثابت رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم کو خضرِ راہ بنانے کا روشن نظریہ بھی دیا کہ

توشہ میں غم واشک کا ساماں بس ہے　　افغان دلِ زار حدی خواں بس ہے

رہبر کی رہِ نعت میں کچھ حاجت ہو　　نقشِ قدمِ حضرتِ حساں بس ہے

جب ایک مداحِ رسول اپنے عشق وعرفان کی ترجمانی کے لئے نعت کا حقیقی مزاج اور زبان وبیان مکمل طور پر سمجھ کر قرآن وحدیث اور احکامِ شریعت کوملحوظ رکھ کر اس راہِ پُر خطر پر چلنا شروع کرتا ہے تو یہی دشوار گزار راستے اسے کامیاب ترین منزل سے آگاہ کرتے ہیں ۔ جہاں پہنچ کر ایمان ووجدان کا برملا اعلان ہوتا ہے کہ۔

اللہ کی سر تا بہ قدم شان ہیں یہ　　ان سانہیں انسان وہ انسان ہیں یہ

قرآن تو ایمان بتاتا ہے انھیں　　ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

اب تک جو باتیں پیش کی گئی ہیں ۔ان کو داخلی سفر کا منظر نامہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایک مداح کو کن معاملات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک اس شعوری ماحول کا ادراک ایک مدحت نگار نہیں رکھتا اُسے نعت کے اعلیٰ تصورات کی کرنیں نہیں مل سکتیں۔ کیونکہ صنفِ نعت پر قرآن وحدیث کا سب سے زیادہ فرمان جاری ہوتا ہے اور علومِ شریعہ پھر اسکی تفہیم وتشریح اور ترجمانی کے آداب سکھاتے ہیں۔ قرآن کے فرمان میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدس کا عرفان ہوتا ہے اور حدیث کی روشنی میں اظہار وبیان کا مسئلہ حل کیا جاتا ہے۔اس طرح احکامِ شریعت نعت کی ہر منزل میں مداح رسول کی رہنمائی کرتے ہیں ۔ تاکہ بیان میں افراط وتفریط پیدا نہ ہو جائے ۔ اور نہایت محتاط پیرائے میں اپنے جذبات واحساسات اور افکار ونظریات کوشعری قالب میں ڈھال سکے ظاہر ہے ایسی صورت میں تخیل کی بے راہ روی بھی منزل آشنا ہو جاتی ہے۔

نعتِ رسول کے حوالے سے گفتگو کرنے والے اربابانِ فکر ونظر الملفوظ کے حوالے سے ارشاداتِ اعلیٰ حضرت پیش کرتے رہے ہیں کہ حقیقتاً نعت شریف کا لکھنا نہایت مشکل ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہو جاتی ہے البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے غرض کہ ایک جانب اصلاً حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے (الملفوظ)

ایک دوسرے مقام پر امام احمد رضا محدّث بریلوی ارشاد فرماتے ہیں۔

'' مولانا کافیؔ اور حسنؔ میاں مرحوم کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے ان کو مَیں نے نعت گوئی کے اصول بتادئے تھے ان کی طبیعت میں ایسا رنگ رچا کہ ہمیشہ کلام اسی معیارِ اعتدال پر صادر ہوتا جہاں شبہ ہوتا مجھ سے دریافت کر لیتے ''

میں نے یہاں دو اقتسابات نقل کئے ہیں عرضِ مدّ عایہ ہے کہ اصولِ نعت گوئی سے متعلق با ضابطہ کوئی کتاب میرے علم میں نہیں آئی ہے مگر فرموداتِ اعلیٰ حضرت میں ایسے بہت سے گوشے ہیں جن پر اگر توجہ دی جائے تو مداحانِ رسالت کی رہنمائی کے لئے ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔اعلیٰ حضرت نے نعت گوئی کے اصول جو حسن میاں کو بتائے تھے اگر وہ تحریری شکل میں محفوظ ہوتے تو حدائق بخشش کی طرح ہر صاحبِ فکر و نظر استفادہ کرتے نظر آتے فی الحال چند رہنما اصول حیاتِ اعلیٰ حضرت حصہ اول سے پیش کر رہا ہوں جسے بنیاد بنا کر پوری کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے (۱) نعت شریف کا لکھنا بہت مشکل ہے تلوار کی دھار پر چلنا ہے اگر اتنا بڑھا کہ الوہیت میں پہنچا جاتا ہے تو مارا گیا اور شمہ برابر تنقیص ہوئی تو مارا گیا (۲) وہ الفاظ جو معشوقِ مجازی کے لئے آتے ہیں جیسے رعنا، دلربا، نعت شریف میں ممنوع ہیں (۳) تشبیہاتِ تانیثی کا استعمال نہ ہو جیسے لیلیٰ (۴) نیز بجائے نامِ اقدس (محمد ﷺ) اسمائے صفاتی ہوں تو بہتر ہے (۵) خصوصاً ندا کے وقت مثلاً یا رسول اللہ، یا حبیب اللہ، ضروری ہے نامِ اقدس لے کر ندا حرام ہے (۶) غیر ندا میں بھی ساقی کوثر، آفتابِ رسالت، شفیع المذنبین وغیرہ کہنا اور لکھنا چاہئے (۷) اسی طرح یثرب، کالی کملیا، رشکِ قمر وغیرہ متروک ہیں (۸) تخیلات خلاف واقع یا مبالغات نہ ہونا چاہئے مثلاً '' حضور کے فراق میں دن رات روتا ہوں '' (۹) دیگر انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مراتب عالیہ ملحوظ رہیں معاذ اللہ توہین نہ ہونے پائے (۱۰) نعت خواں کو چاہئے کہ بیت الخلا میں تخیلات پر زور نہ دیں نیز جو شعر نعت میں آچکا ہو اس کو من و تو کی طرف منسوب نہ کرنا چاہئے۔

☆☆☆

محبتِ رسول واحترامِ رسالت

نعت گوئی کی پہلی شرط عشق مصطفےٰ ہے اور یہی مدارِ ایمان وعرفان بھی ہے۔ بغیر حُبِ نبی اتباع کا تصوّر ہی موہوم ہے۔ بلکہ تمام عبادتیں ناقص اور فضول ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

''آپ فرمادیں اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہارا کنبہ اور تمہارے کمائے ہوئے مال تمہاری وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے. اور تمہاری پسندیدہ رہائش گاہیں یہ سب کچھ اگر تم کو اللہ، اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہوں تو تم اللہ کے حکم (عذاب) کا انتظار کرو۔ اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

قرآن نے انسانی فطرت کے ان تمام جذبوں کو جو عشق ومحبت کی بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں انھیں کتنی جامعیت کے ساتھ عشقِ رسول کے پیمانے میں ڈھال کر پیش فرمایا ہے۔ اس کا ادراک اہل بصیرت ہی کر سکتے ہیں۔ خود رسولِ کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

''تم میں کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُسکے نزدیک اسکے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ میں محبوب نہ ہوجاؤں۔'' خداوند قدوس سے محبت کے دعویدار بھی اس وقت تک اپنے دعوے میں سچے نہیں ہو سکتے جب تک آقائے نامدار ﷺ کی مکمل اتباع عشقِ رسالت کے تحت نہیں کرتے۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ''میرے حبیب! آپ فرمادیں کہ اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو (پھر) اللہ بھی تم سے محبت فرمائے گا۔''

رسولِ رحمت ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے محبت وعقیدت ہی اصل ایمان ہے۔ جس کی بے شمار مثالیں قرآن واحادیث میں نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی صحابۂ کرام کی حیات کے تمام گوشوں سے لاتعداد مثالیں ملتی ہیں جسے بطورِ شہادت وعلامتِ عشقِ رسالت استعمال کی

جاتی ہیں اور چونکہ عشق والفت کی بے شمار علامتیں ہیں لیکن ان میں ذکرِ کثیر یعنی آثارِ نعت گوئی کو جوانفرادیت واہمیت حاصل ہے حدیثِ پاک نے بھی اسے سند اعتبار عطا کی ہے۔

''جو شخص کسی شئے سے محبت رکھتا ہے اسکا ذکر بکثرت کرتا ہے''

نعت گوئی دراصل عشقِ رسالت مآب کے اظہار کا نام ہے جس میں مداحِ مصطفے مختلف طرز وادا اور اسلوبِ بیان کے وسیلے سے بارگاہِ نبوّت میں اپنی غلامی کا خراج والہانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کیونکہ جب آتشِ عشق کی لو تیز ہو جاتی ہے تو زندگی و بندگی میں معنویت کے ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ جن سے سوز و گداز، کیف ونشاط اور درد وغم کی مختلف صورتیں خود بخود عاشق زار کے سخن سے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح ایک ہی بات کو ایک ہی واقعہ کو ایک ہی مضمون کو اور ایک ہی کیفیت کو جدت وندرت کے ساتھ سو سو طرح سے بیان کرتا چلا جاتا ہے ان تمام رویوں اور معنوی جہتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ انسان کے پاس ایک منفرد پہچان ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے جذبۂ فکر اور محسوسات کو انفرادی نوعیت سے پیش کرتا ہے جس کے سبب نعت گوئی میں تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں ایک ناقد کا خیال ہے کہ ''شعری تجربہ چونکہ انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے اس لئے ہر شاعر کے یہاں اسکی صورت مختلف ہوتی ہے۔ ایک ہی واقعہ، احساس یا تصور مختلف اشخاص کے ذہنوں پر مختلف اثرات مرتب کرتا ہے اور اس کے بیان کرنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ واقعے یا مشاہدے میں آنے والی چیز نے انھیں کس طرح متاثر کیا ہے۔ ایک شخص اسے راست واقعے کی شکل میں بیان کر سکتا ہے لیکن دوسرے کے لئے اس طرح کا بیان سپاٹ اور غیر دلچسپ ہو سکتا ہے اور وہ بیان کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے پہلو کو نمایاں کر سکتا ہے۔ کوئی اشارے یا رمز و کنایے میں بات کر سکتا ہے کوئی استعاراتی انداز اور علامتوں کے سہارے اپنی بات کو پیش کر سکتا ہے۔''

اس نازک صورت میں بھی شریعتِ اسلامیہ مداحِ رسول کی مکمل رہنمائی کرتی ہے اور

مقامِ رسالت ودربارِ نبوت کے آداب وتعظیم کا لائحہ عمل قرآنی احکامات کی شکل میں پیش کرتی ہے قرآنِ حکیم کا یہ ایمان افروز تیور ملاحظہ کریں:-

(الف) ''اے ایمان والوتم اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند نہ کرواور اُن کے حضور زور سے باتیں نہ کروجس طرح تم آپس میں چیخ کر باتیں کرتے ہو(اس طرح کرنے سے) کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہوجائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو''۔

(ب) ''تم رسول کے پکارنے کوآپس میں ایسانہ ٹھہراؤ جیسا کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کوپکارتے ہو''۔

(ج) ''یقیناً جوآپ کے حجرے کے باہر سے پکارتے ہیں اُن میں اکثر عقل نہیں رکھتے ہیں۔''

قرآنِ مقدس کے مذکورہ ارشادات واحکامات کی روشنی میں نعت گوئی کے جو اصول وضوابط متعین ہورہے ہیں ان میں عشق رسول اور تعظیمِ رسالت کی اہمیت وانفرادیت جہاں طے پارہی ہے وہیں نعت گوئی کے لئے زبان وبیان طرزِ ادااور اسلوب وآہنگ جیسے خاص ادبی امور بھی سامنے آگئے ہیں۔جن میں چند باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) نعت میں عشق ومحبت کا اظہاروہی مداحِ رسول کرے جس کے دل میں صحیح معنوں میں عشقِ رسالت کا چراغ روشن ہومحض روایتی فکر وتہذیب کی ہمرکابی میں عاشقانہ انداز اختیارکرنے کی کوشش نہ کرے۔ورنہ یہی مبالغہ آمیزی اُسے دربارِصداقت میں کذب بیانی کا مرتکب کردیگی۔

(۲) جب ذہن وقلب کی وادی میں رسولِ ہاشمی ﷺ کا خیالِ محترم بیدار ہوجائے اور قلب کے سمندر میں جذبات واحساسات کی تیز لہریں پوری قوت واضطراب کے ساتھ بیدار ہو جائیں تو اس عالم میں شریعتِ اسلامیہ کی حدود وقیود کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے اپنی عقیدت والفت اور عشق وعرفان کے جواہر پاروں کوشعری پیکر عطا کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

(۳) فنی حسن اور فکری وجدان کے بغیر کوئی کلام ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔اگراس میں

خلوص ومحبت کی سچی امنگ اور صداقت وحقیقت کی والہانہ ترنگ نہ شامل ہوتو وہ لفظوں کے وسیلے سے بعض خیالات کا موزوں اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔

(۴) یہ امر ذرا تفصیل طلب ہے کیونکہ اس سے قبل جو آیات پیش کی گئی ہیں ان میں سلیقۂ نعت گوئی کے لئے نہایت اہم نکات پوشیدہ ہیں اگر آدابِ نعت کو پیش نظر رکھیں تو مذکورہ آیات کی روشنی میں ادبی وفنی لوازمات کی تشریح وتفہیم کے لئے نہایت اہم اشارے ملتے ہیں جنھیں جدید تنقیدی نظریات کے تحت بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں شعری تجربہ ایک بنیادی گوشہ ہے جس کے تحت انفرادی فکر وخیال اور انداز وبیان پر بحث ہوتی ہے اسی کے ساتھ ہیئتی مسائل اور لسانی معاملات بھی موضوعِ سخن بنتے ہیں ان گوشوں میں شعری آہنگ کے حوالے سے کسی کلام کی معنوی اور صوری اہمیت کا اندازہ کرتے ہیں شعری آہنگ ایک نازک اور دشوار گوشہ ہوتا ہے میں یہاں کوشش کروں گا کہ شعری آہنگ کو، آواز کی علامت کے سہارے قرآن واحادیث کے فرامین کو بھی پیش کروں تا کہ عام شعری آہنگ اور نعتیہ شعری آہنگ کا فرق سمجھ میں آئے چونکہ شعری آہنگ اس آواز کی بازگشت ہے جو فکر وسخن کی تہہ در تہہ معنویت کی دنیا سامنے لاتی ہے اس لئے نعت میں

یہ ''آواز'' کبھی قرآن وحدیث کی ترجمان ہوتی ہے اور کبھی تفسیر وفقہ اور علمِ کلام کی تعبیر، اور کبھی خالص وجدان وشعور اور کیفیات وجذبات کی تصویر بھی، ان امور کے پیشِ نظر جب نعت گو کسی ایسے نازک مقام پر پہنچ جائے اور کوئی نیا گوشہ ندرت وجدت کے تحت سامنے آجائے تو ان فکری وجذباتی اور شعوری جواہر پاروں میں سب سے پہلے یہ تلاش کرے کہ کہیں یہ آواز قرآن وحدیث کے بنیادی عقائد ونظریات سے متصادم تو نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس کی صحت کے تعلق سے مطمئن ہو جائے۔ اس ''آواز'' کی دوسری سطح کا تعلق خالص شعری افکار سے ہے۔ جہاں وجدان وتعقل کی ہمرکابی ہوتی ہے یہ سفر براہ راست کسی ایک راستے سے نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی سطح پر بے شمار چھوٹی بڑی پگڈنڈیوں سے گزر کر منزل پر پہنچتا ہے ایک واقعہ یا کسی کیفیت کو مختلف زاویوں اور

جہتوں سے دیکھا جاتا ہے تاکہ نعتیہ شاعری محض کلامِ منظوم بن کر نہ رہ جائے۔

اس سلیقۂ سخن میں عام طور پر کسی احکام یا پیغام کی ترجمانی تأثراتی انداز میں کی جاتی ہے جہاں فکری پرواز کے لئے نئے نئے آفاق مل جاتے ہیں۔ مگر یہاں بھی شریعتِ اسلامیہ کسی طرح کی بے اعتدالی ہرگز گوارہ نہیں کرتی۔ لہٰذا ایک باشعور مداحِ رسول کو شعوری طور پر کوشش کرنی چاہیئے کہ کوئی ایسا تأثر اس ''آواز'' سے ہم آہنگ نہ ہو جائے جو دین و شریعت سے بے نیاز ہو خواہ اسکی نوعیت براہ راست ہو یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں خدشہ ہو سکتا ہے؟ اس آواز کی تیسری سطح کا تعلق خاص طور پر زبان و بیان سے ہے۔ جہاں شعری رسمیات کے ساتھ لفظیات اسلوبیات اور ساختیات کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے مگر یہاں بھی قرآنِ مقدس کا فرمان ہے کہ مداحانِ رسول کی مدحت تمہارے آپسی کلام (مجازی شعرو ادب) سے برتر ہونا لازمی ہے قرآن نے دراصل مداحِ رسول کو ایک شائستہ مہذب اور معیاری سلیقۂ اظہار اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ زبان و بیان کی خوش اسلوبی بھی رسول اللہ کی تعظیم و تکریم کی واضح مثال بن جائے۔

نعت گوئی میں اس طرح کے خطرات عموماً محبوبِ کردگار ﷺ کے وصل و ہجر اور فریاد و التجا کے اظہار کے وقت پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ جب عشق والفت کی جذباتی فضا مکمل اضطراب کے عالم میں ہوتی ہے تو کبھی کبھی فطری تقاضوں کے تحت دامن ضبط و شکیب ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ جس کے سبب بارگاہِ محبت و عقیدت کے آداب و تکریم میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ جو خالص عاشقانہ رویوں کا حامل ہے اگر بغور دیکھا جائے تو اپنے ساتھ بے شمار مصائب لے کر آتا ہے۔ پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ مداح وفورِ شوق اور شدت وارفتگی میں حقیقی آداب و تہذیب کی فضا سے دور نکل جاتا ہے۔ اور ایک عام مجازی عاشق کی طرح اپنے محبوب پر طعن و تشنیع کے علاوہ بے محابا اسکی ذات پر انگشت نمائی کر بیٹھتا ہے۔ جس کے باعث عشقِ حقیقی کی بجائے عشقِ مجازی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی مداح اپنی واردات و کیفیات کے تجربات وانکشافات کے اظہار میں ایک عام عاشق کا ہمنوا قرار پاتا ہے۔ جہاں

طنزوانانیت کا بے سروپا مزاج کا ہونا کوئی نئی بات نہیں جس کے باعث نعتیہ شاعری کا پاکیزہ اور عارفانہ مزاج مجروح ہو جاتا ہے اسی لئے دربارِ رسالت میں ایک مداح کو اپنی محبوبیت کے اظہار سے قبل تقویٰ کی آزمائش سے گزرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ اسے محبوب شناسی اور خود آگہی کا عرفان وادراک ہو جائے۔ تقویٰ کی آزمائش میں وہی مداح کامیاب ہوتا ہے جسکی زندگی شریعتِ اسلامیہ کے اصول وضوابط پر پوری طرح عمل پیرا ہوتی ہے اور وہ احکام اسے تمام دشوار گزار راہوں سے گزرنے کے لئے وسائل فراہم کرتے ہیں۔ اس نہج پر جب وہ مسلسل سفر کرتا ہے تو قرآنِ مقدس اس کے نوائے عشق وعرفان کو اجرِ عظیم سے سرفراز کرنے کا برملا اعلان کرتا ہے۔

''جولوگ نبی کی بارگاہ میں دھیمی آواز سے کلام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک تقویٰ کی آزمائش میں کامیاب ہیں ان کے لئے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔''

ابھی تک آواز کے تعلق سے پیدا ہونے والے خطرات بیان کئے گئے ہیں اب اگر لفظ ''آواز'' کو ''آہنگ'' کا معنیٰ دے کر دیکھا جائے جو دراصل شاعری کی روح کا درجۂ اعتبار رکھتا ہے تو اس سے نعت گو خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے اس خیال کے تحت چند ناقدین کے نظریات پیش کرتا ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:-

''شاعری کا آہنگ یا موسیقی وہ نہیں جو ساز یا ترنم کے ذریعہ ظاہر ہو۔ شاعری کا آہنگ دراصل وہ موسیقی ہے جو خاموش ہی پڑھنے میں نمایاں ہو جسے ساز یا ترنم کی ضرورت نہ ہو بلکہ جسے آپ چپ چاپ پڑھیں تو الفاظ آپ کو از خود سنائی دیں۔ کبھی پست، کبھی بلند، کبھی تیز، کبھی مدھم، ان کی ہزاروں شکلیں آپ کے داخلی سامع پر اثر انداز ہوں یہ آہنگ معنیٰ کا مرہونِ منت یا اس کے تابع ہوتا ہے لیکن اس کے بغیر معنیٰ کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نظریہ یوں ہے:-

''صوت کی سطح خالص آہنگ کی سطح ہے لیکن اگر اس سے یہ فرض کر لیا جائے کہ آہنگ

سے مراد معنیٰ کی کلی نفی ہے تو یہ بھی غلط ہوگا کیونکہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آہنگ سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے فضا سازی یا سماں بندی میں مدد ملتی ہے اور یہ فضا سازی کسی بھی معنیاتی تاثر کو گہرا یا تیکھا کر سکتی ہے۔"

مولانا عبدالنعیم عزیزی لکھتے ہیں:-

"آہنگ کے لغوی معنیٰ ہوتے ہیں صوت یا آواز اور اصطلاحی معنیٰ ہوتے ہیں لے، دھن، ترنم، نغمہ موسیقی وغیرہ۔ ادب میں نثر و نظم کے صوتی حسن کو آہنگ کہتے ہیں۔ کسی فن پارے کا یہ صوتی حسن یا آہنگ پڑھنے والے کے اپنے لہجہ، طرز، دھن، لحن یا ترنم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کیونکہ طرزِ ادائیگی اور لہجۂ خواندگی الفاظ کے صوت و معنیٰ سے مختلف تاثر پیدا کر سکتے ہیں۔ نظم میں قافیوں سے پیدا ہونے والی خوش آہنگی یا کسی خاص بحر کی وجہ سے بننے والے آہنگ کو بھی اس آہنگ سے جدا سمجھا جائے گا اس آہنگ اور معانی میں ناگزیر ربط ہوتا ہے۔ یہ آہنگ خارجی نہیں داخلی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور نامیاتی ہوتا ہے۔"

مذکورہ ناقدین کے خیالات کی روشنی میں صوت و آہنگ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نعت گوئی میں اس کی کتنی قدر و قیمت ہے جسے گزشتہ اوراق کی تحریروں میں پیش کیا جا چکا ہے ۔ساتھ ہی نعت کی معنوی وصوری سطح کو محسوسات کے پیکر میں دکھایا گیا ہے۔ اور تمام دشوار مراحل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جسے شعوری طور پر مداحِ رسول محسوس کر سکتا ہے۔

پروفیسر حفیظ تائب کے الفاظ میں۔ "نعت اس کیفیت کا نام ہے جب فکرِ شاعر ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی طرف پورے انہماک و اخلاص کے ساتھ رجوع کرتا ہے، اس کیفیت کے اظہار کے لئے اس سے بہتر لفظ نہیں مل رہے ہیں۔

شان ان کی سوچئے اور سوچ میں کھو جایئے

نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

یہ کیفیت خدائے کریم کی خصوصی عنایات میں سے ہے۔ اس کیفیت کے الفاظ میں

ڈھلنے کا عمل بھی تائیدِ ایزدی کے بغیر ممکن نہیں، یہاں قدرتِ فن ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہے۔

کیا فکر کی جولانی کیا عرضِ ہنر مندی

توصیفِ پیمبر ہے توفیقِ خداوندی

نعت اور غزل کے محبوب میں زمین و آسمان کا فرق ہے نعت کا محبوب قرآن و احادیث اور دیگر صحائفِ آسمانی کے آئینے میں نظر آتا ہے۔اس محبوب کو مجاز در مجاز کی صورت میں دیکھنا خداوندِ کریم کے غضب کو دعوت دینا ہے کیوں کہ یہاں قدم قدم پر توہین کا اندیشہ رہتا ہے۔نعت کے محبوب کی مثال کہاں وہ تو خود آپ اپنی مثال ہیں جسے خدا نے اپنا محبوب بنایا اور اسے محبوبیتِ کبریٰ کے منصب پر فائز کیا اور اسی کی محبوبیت کو میزان قرار دیا ہو یعنی جو محبوب کو محبوب ہوا وہی رب کا محبوب، جس کی ہر ایک ادا کو قرآن کی سورۃ میں محفوظ کر دیا۔غزل کا محبوب ہما شما کا محبوب، مادیت کے خمیر سے ابھرا ہوا پیکر، نفسانیات، خواہشات اور تکلفات کے جھولے میں جھولنے والا، خاک کو افلاک سے کیا نسبت ہمیں ہر اس خیال سے بچنا ہے جو خدا کے محبوب کے شایانِ شان نہ ہو۔

☆☆☆
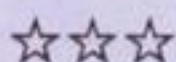
الوہیت اور رسالت کا تصوّر

نعت گوئی میں الوہیت و رسالت کے فرق اور امتیاز کا خیال رکھنا نہایت لازمی قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہی وہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اگر مداح افراط و تفریط کا مرتکب ہو گیا تو ساری عبادتیں برباد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہاں نہ افراط کی گنجائش ہے اور نہ تفریط کی۔ کیونکہ اگر بڑھتا ہے تو بات الوہیت تک پہنچ جاتی ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیصِ رسالت ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے خطِ امتیاز کو ہمیشہ نگاہوں میں رکھنا ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ شانِ الوہیت اور عظمتِ رسالت کے درمیان قربت و محبوبیت کے جلوؤں کو بھی سامنے رکھنا بے پناہ لازمی امر ہے۔ تاکہ افراط و تفریط کا کوئی گوشہ ہی نہ نکلنے پائے امام احمد رضا ﷫ کیا خوب معیارِ سخن عطا فرماتے ہیں۔

سرور کہوں کہ مالک و مولیٰ کہوں تجھے ۔۔۔ باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے
لیکن رضا نے ختم سخن اس پہ کر دیا ۔۔۔ خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

مفتی اعظم ہند ﷫ فرماتے ہیں۔

تری تعریف میں جتنا بڑھیں سب تجھکو شایاں ہے ...... فقط اک ناروا یہ ہے کہ یوں کہیئے خدا تو ہے
خدا تیرا ہے اور تو تو اس خدا کا پاک بندہ ہے ...... خدا تو تو نہیں نورِ خدا ظلِ خدا تو ہے

اکثر نعت گوئی میں ایسی منزل آجاتی ہے۔ جہاں فکر و شعور کی قوتیں بے آب ہو جاتی ہیں اور عشق و عقیدت کی تجلی سے کیف و ادراک کے بال و پر سلگ اٹھتے ہیں۔ یعنی جب محبوب و محب کی قربت کا منظر دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلے پر نظر آنے لگتا ہے تو دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں عقل و شعور کے تیز و طرار گھوڑے کانپ اٹھتے ہیں ایسے عالم میں شرعی احتیاط ہی خضرِ راہ ثابت ہوتی ہے

مثلاً ۔ وہی لامکاں کے مکیں ہوئے سرِ عرش تخت نشیں ہوئے
یہ نبی ہیں جنکے ہیں یہ مکاں وہ خدا ہے جسکا مکاں نہیں

نوٹ: عقیدۂ توحید و رسالت سے متعلق بہارِ شریعت حصہ اول ملاحظہ فرمائیں مصنف صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ

صفاتِ الٰہیہ اور مخلوقی صفات

نعت میں خداوند قدوس اور محبوب دو عالم ﷺ کی محبوبیت کا اظہار کرنا مدحت نگاروں کا محبوب ومقبول طریقہ رہا ہے کہ خدائے لم یزل نے قرآن مقدس میں بے شمار مقامات پر رسولِ کریم ﷺ کی عظمت ورفعت کو آشکار فرمایا ہے اور محبوب کائنات کی مقدس اداؤں کا اس اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا ہے کہ فکر وشعور کی نگاہیں روشن ہو جاتی ہیں اور نوعِ انسانی کے سامنے محبت واطاعت کا ایک لازوال لائحہ عمل آجاتا ہے۔ شعراء کرام نے اس محبوبیت کو اپنی فکری وقلبی بصیرت وبصارت کے ذریعہ پیش کیا ہے لیکن بعض شعراء وحدانیت ورسالت کے بنیادی عقیدے سے بے پرواہو کر محض دنیوی محبوب ومحبّ اور عاشق ومعشوق کی سطح پر اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کر گئے ہیں جس کے سبب الوہیت اور رسالت سے متعلق اعتقادی حدِ امتیاز کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مثلاً

(۱) صدمۂ ہجر خدا سے بھی گوارہ نہ ہوا

(۲) محمد کو بنا کر خود خدا کو بھی سرور آیا

(۳) محمد کو زمیں پر بھیج کر دل لگ نہ سکا تھا

(۴) خدا نے پاس اپنے رکھ لیا سایہ محمد کا

(۵) محمد کی اداؤں پر خدا قربان ہوتا ہے

(۶) محمد مصطفٰے بن کر خدا کے دلربا آئے

مذکورہ مصرعوں میں جیسا کہ ظاہر ہے بے شمار شرعی نقائص موجود ہیں۔ اگر اسلامی عقائد اور شرعی قوانین شعراء کی نگاہوں میں ہوتے تو اس طرح کی خامیاں پیدا نہ ہوتیں۔ جیسا کہ کتاب وسنت میں واضح طور پر احکامات ملتے ہیں کہ خدائے لم یزل کی ذات حدود وقیود سے جہات وکیفیات سے اور جسم وجسمانیات سے پاک ومبرا ہے۔ اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ حیات، قدرت، علم وسمع، بصر، کلام، ارادہ اور مشیت اسکی صفات ذاتیہ ہیں مگر کان آنکھ زبان سے اسکا دیکھنا سننا کلام کرنا نہیں کہ یہ سب اجسام ہیں اور اللہ اجسام سے پاک ہے۔

شریعت اسلامیہ کے نزدیک اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات وصفات کوکسی انسانی صفات یا کیفیات مثلاً سونا، جاگنا، کھانا، پینا، سرور میں آنا، صدمہ اٹھانا، بے قرار ہونا، شیدا ہونا، فدا ہونا، قربان ہونا اور وصل وہجر کے دیگر معمولات پر قیاس کرنا گمراہیت کی پہلی منزل ہے۔ نعت گوئی میں جب عام عشقیہ شاعری کی رسمیات کے رنگ وآہنگ اختیار کئے جاتے ہیں تو اس طرح کا کلام سامنے آتا ہے اس لئے مداحان رسالت کو حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

چونکہ بعض انسانی صفات مثلاً سمع وبصر وغیرہ کا تعلق بھی وحدہٗ لاشریک سے ہے مگر یہ صفات اسکی ذاتی اور غیر حادث ہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:- فجعلناہ سمیعاً بصیرا۔ یعنی ہم نے انسان کو سمیع وبصیر بنایا ہے۔ لیکن انسان اپنی صفات میں محتاج ہے اور خداوندِ قدوس کسی کا محتاج نہیں۔ انھیں مسائل کے پیش نظر فقہائے کرام نے نبی کریم ﷺ کی ذات وصفات کی تفہیم کے لئے عطائی کا تصور پیش فرمایا ہے، جیسے علم غیب، قدرت واختیارات اور حیات وغیرہ کے لئے ذاتی اللہ تعالیٰ کے لئے اور عطائی نبی دوجہاں ﷺ کے لئے بیان فرمایا علامہ ارشد القادری فرماتے ہیں۔

''خدا کی ہر صفت میں چار چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے ہر گز تسلیم نہیں کی جاسکتیں۔ ☆اول۔ ازلی ہونا یعنی وہ ہمیشہ سے ہے ☆دوم۔ ابدی ہونا یعنی ہمیشہ رہیگا ☆سوم۔ ذاتی ہونا یعنی کسی نے عطا نہیں کی ہے ☆چہارم۔ لامحدود ہونا یعنی اسکی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ اس تمہید کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ صفت جس میں یہ چاروں چیزیں پائی جائیں خدا کی صفت خاص ہوگی، کسی اور کے لئے ماننا یقیناً غلط ہوگا مگر ایسی صفت جس میں یہ چاروں چیزیں مفقود ہوں خدا کی صفت خاص نہیں۔ خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے مانی جاسکتی ہیں رسول پاک ﷺ کے لئے ہم اہل سنت وجماعت جس علم غیب کو مانتے ہیں وہ ازلی، ابدی، ذاتی اور لامحدود نہیں بلکہ غیر ازلی، غیر ابدی، عطائی اور محدود ہے۔ محدود کے دائرے میں رہتے ہوئے ہم اہل سنت رسول پاک ﷺ کو عالم ماکان ومایکون کہتے ہیں۔ اس قسم کا عقیدہ ونظریہ خدا پرستی کے جذبے کو اُجاگر کرتا ہے۔ شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں''۔

مگر اس کے باوجود بعض مسلمان کہلانے والے فرقوں میں اس پر شدید اختلاف ہے۔

نعتیہ شاعری میں اس طرح کے خطرات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب روحانی کیفیات

مجازی عشق کی اصطلاح میں پیش کیے جاتے ہیں یا جب ماورائی فکر کو جذباتی اور وجدانی رنگ و آہنگ کے ذریعہ جلمۂ اظہار دیا جاتا ہے اگر ان نازک مقامات پر شریعت کی رہبری عطا ہو جائے تو فکر و شعور کی نگاہیں چمک اٹھتی ہیں حدیث پاک ہے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں ”انا مراة جمال الحق “ یعنی میں تو حق کے جمال کا آئینہ ہوں اور پھر حضور کا فرمان ہے کہ ”من رآنی فقد رأی الحق“ یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا اسی طرح قرآن کا اعلان ہے ” قد جانکم من اللہ نور و کتاب مبین “ یعنی تمہارے پاس آیا نور اور روشن کتاب یہی نہیں بلکہ رسول رحمت نے ایک مقام پر فرمایا ”خلقت من نور اللہ “یعنی میں اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا ہوں اس قربت کے آفاقی تصور کو قرآن نے یوں پیش کیا ”ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ “یعنی اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی تم نے نہ پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی پھر کہیں قرآن کا ارشاد یوں بھی ہوا کہ ”ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ یداللہ فوق ایدیھم “ بیشک جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں درحقیقت وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ مذکورہ ارشادات کی روشنی میں علمائے کرام و شعرائے عظام نے وحدانیت و رسالت کے فرق و امتیاز کو ملحوظ رکھ کر محبوب و محبّ کے تصورات میں پرتو جمالِ قدرت، مظہر شان وحدت، ظل ربّ، حسن ظہور قدرت آئینۂ کمال قدرت کو سامنے رکھتے ہوئے کیا حسین پیرائے میں ایمان افروز سلیقۂ سخن عطا فرمایا ہے۔

محمد مظہر کامل ہے حق کی شان و عزت کا...... نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز وحدت کا

یہی ہے اصل عالم مادۂ ایجاد خلقت کا...... یہاں وحدت میں برپا ہے عجب ہنگامہ کثرت کا

خدا نے ذات کا اپنی تمہیں مظہر بنایا ہے...... جو حق کو دیکھنا چاہیں تو اس کے آئینہ تم ہو

اللہ اللہ آپ کا دیدار ہے دیدارِ حق...... آپ کا دربار ہے دربارِ باری یا رسول

قل کہہ کے اپنی بات بھی لب سے ترے سنی...... اللہ کو ہے اتنی تری گفتگو پسند

خدا ہے تو نہ خدا سے جدا ہے اے مولیٰ...... ترے ظہور سے رب کا ظہور آنکھوں میں

پروفیسر محمد اقبال جاوید لکھتے ہیں۔ ”خیال رہے اکثر نعتیں ذرا سی بے احتیاطی (بزعم خویش) سے حمد بن جاتی ہیں۔ اور اکثر نعتیں ایسی ہیں کہ اگر انھیں ”حضور کے سراپا کے بغیر پڑھا جائے تو حمد لگتی ہیں۔“

یہی ہے فلسفۂ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ خدا کے بعد سبھی کچھ کہو خدا نہ کہو

نبی اور غیرِ نبی میں فرق و امتیاز

نعت گوئی کے بنیادی تقاضوں میں الوہیت اور رسالت کے فرق و امتیاز کو برقرار رکھنے کے بعد سب سے زیادہ نازک مقام اس وقت آتا ہے جب نبیٔ اکرم ﷺ کے مخصوص اوصافِ جمیلہ اور عام انسانی صفات کے درمیان حدِ امتیاز کو نگاہوں میں رکھنا پڑتا ہے کیونکہ جس طرح الوہیت اور رسالت کے حدود و قیود کی مکمل پاسداری جزوِ ایمان ہے اسی طرح ایک نبی اور امتی کے فرق کو ملحوظ رکھنا عین ایمان ہے نعت گوئی میں یہ مسئلہ اس وقت دشوار ہو جاتا ہے جب ایک عام انسان اور ایک نبی میں ایک چیز بظاہر قدرِ مشترک نظر آتی ہے۔ جسے ''بشریت'' کہتے ہیں۔

لہٰذا فلسفۂ بشریّت اور عبدیّت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے، قرآنِ عظیم کے ارشاد پر ہمارا ایمان ہے رب تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب کی زبان سے اعلان کرواتا ہے'' قل انما انا بشر مثلکم ''یعنی اے محبوب آپ کہدیں کہ میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں۔

اب اس ارشادِ قرآن کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق منظر اور پس منظر دونوں پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی کے ارشادات پیش کروں جسے انہوں نے علم القرآن نامی کتاب میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں تحریر کیا ہے۔

(۱) جن آیتوں میں نبی سے کہلوایا گیا ہے کہ ہم تم جیسے بشر ہیں وہاں مطلب یہ ہے کہ خالص بندے ہونے میں تم جیسے بشر ہیں کہ جیسے تم نہ خدا ہو نہ خدا کے بیٹے نہ خدا کے ساجھی شریک ایسے ہی ہم نہ خدا ہیں نہ اس کے بیٹے نہ اس کے ساجھی خالص بندے ہیں۔

(۲) جن آیتوں میں نبی کو بشر کہنے کا فتویٰ دیا گیا ہے اور انہیں بشر کہنے والوں کو کافر کہا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نبی کی ہمسری اور برابری کا دعویٰ کرتے ہوئے انہیں بشر کہے یا انکی

اہانت کیلئے بشر کہے یا یوں کہے کہ جیسے ہم محض بشر ہیں نبی نہیں ایسے ہی تم نبوّت سے خالی ہو محض بشر ہو وہ کافر۔۔ دوسری جگہ متعدد آیاتِ کریمہ پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

ان جیسی تمام آیتوں میں فرمایا گیا کہ پیغمبر کو بشر کہنا اولاً شیطان کا کام ہے پھر ہمیشہ کفار نے کہا، مومنوں نے یہ کبھی نہ کہا اور ان کفار کے کفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انبیاء سے برابری کے دعویدار ہو کر انہیں اپنی طرح بشر کہتے تھے .... حضور علیہ السلام کا بار بار اپنی بندگی اور بشریّت کا اعلان اس لئے تھا کہ عیسائیوں نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام میں دو معجزے دیکھ کر انہیں خدا کا بیٹا کہہ دیا ایک تو ان کا بغیر باپ پیدا ہونا اور دوسرے مردے زندہ کرنا، مسلمانوں نے صدہا معجزے حضور علیہ السلام کے دیکھے۔ چاند کا دو نیم ہونا، ڈوبے سورج کا پلٹ آنا، کنکروں کا کلمہ پڑھنا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھنا وغیرہ اندیشہ تھا کہ وہ بھی حضور کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہہ دیں، اس احتیاط کے لئے بار بار اپنی بشریّت کا اعلان فرمایا چونکہ کوئی نبی فرشتوں کی جماعت سے نہیں اور نہ جنوں کے گروہ سے ہے ورنہ مافوق الفطرت ہونے کی وجہ سے رشد و ہدایت کا مسئلہ مشکل ہو جاتا۔ اس لئے نبیٔ اکرم کا ارشادِ گرامی ہے ''انا بشر مثلکم ''یعنی میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں کوئی مختلف الجنس نہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیائے کرام مثلِ بشر ہیں اور جو انھیں اپنی طرح بشر مانے وہ کافر ہے تو پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک عام بشر میں اور ایک خاص بشر میں درجۂ امتیاز کا بنیادی تصور کیا ہے۔ جس کی بنیاد پر ایک نبی ہوتا ہے، اور دوسرا امتی، ایک خاص ہوتا ہے، دوسرا عام اس سلسلے میں درج ذیل باتوں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

(ا) نبوت ورسالت کوئی اختیاری اور اکتسابی چیز نہیں ہوتی جو جد و جہد اور تلاش و جستجو سے مل جائے یہ وصفِ امتیاز خدائے تعالیٰ کا خصوصی اکرام ہوتا ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بروزِ ازل ہی منتخب فرمالیا تھا اسی کو رسالت کے منصبِ جلیلہ پر فائز فرماتا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتِ آدم سے حضرتِ عیسیٰ تک مرسلانِ عظام کا ایک عظیم کارواں نظر آتا ہے، جس کے میرِ کارواں

نبوّت ورسالت کی آخری کڑی کی حیثیت سے نبیٔ آخرالزماں خاتمِ پیغمبراں حضور سیدِ کائنات ﷺ کی ذاتِ گرامی ہوئی (۲) دوسری صفت ایک عام انسان اور ایک نبی کے درمیان فرق وامتیاز کا نمایاں پہلو یوں پیدا کرتی ہے کہ انبیائے کرام کی تعلیمات من جانب اللہ ہوتی ہیں وہ ہدایتِ ربانی کے مکمل تابع ہوتے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں فرمانِ خداوندی کے عین مطابق کہتے ہیں۔ اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتے۔ قرآن اعلان فرماتا ہے "وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" یعنی وہ اپنی خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتے بلکہ وہی کہتے ہیں جو ان کا پروردگار ان سے فرماتا ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت عصمت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیائے کرام کو معصوم بنایا ہے۔ ان سے ذہنی وفکری غلطی ہو ہی نہیں سکتی اور نہ اخلاق واعمال کی۔ نفس وشیطان کی دراندازیوں سے ان کے جذبات واحساسات، افکار وتصورات اور اخلاق واعمال سب کے سب مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔ ان کی پوری حیات کسی بھی قسم کے گناہ سے یکسر خالی اور مکمل انسانیت کا معیار وآئینہ دار ہوتی ہے۔ عام بشری زندگی میں وہ سارے امکانات ہوتے ہیں جو نبی کی حیات میں ناممکن ہیں۔ اگر کوئی غیر نبی ذہنی وفکری خطاؤں سے بفضلِ الٰہی محفوظ بھی ہو جائے تو بھی معصوم نہیں ہو سکتا۔

یہ فکر جب عام قصیدہ اور منقبت کی سطح پر نمو پذیر ہوتی ہے تو نعت کا خالص مزاج رخصت ہو جاتا ہے اس لئے حفظِ مراتب کا مکمل لحاظ رکھنا نعت گوئی کا بنیادی تقاضہ ہے۔ ایک انمول اور لازوال آئیڈیل کی تعریف وتوصیف کا معیار عام قصیدوں اور منقبتوں کی سطح پر کرنا انتہائی گمراہی ہے جبکہ نبیٔ اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف کا حقیقی مزاج اور معیار کتاب اللہ عطا کرتی ہے اس کے باوجود بعض شعراء ان اصولوں کا قطعی لحاظ نہیں کرتے وہ مقامِ الوہیت کی پاسداری میں مقامِ رسالت کے حقیقی مرتبہ اور عظمت کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں حتیٰ کہ مقامِ نبوت کو عام بشری سطح پر قصیدوں کے رنگ میں بیان

کرتے ہیں مثلاً

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم ...... نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم

نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم ...... کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی

کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

مسدسِ حالی کا یہ بند شانِ رسالت کا ہرگز آئینہ دار نہیں کیونکہ ان مصرعوں میں بعض الفاظ اس انداز سے نظم کئے گئے ہیں کہ جن سے نعت کا حقیقی مزاج ہی رخصت ہو گیا ہے ان مصرعوں کا صریح مفہوم جو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو محض اتنی بزرگی دی ہے کہ ایک عام انسان فقط ایک بندہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حضور پاک ﷺ ایک بندہ ہونے کے علاوہ ایلچی کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ پیغمبر، رسول اور نبی کے اندر جو مقدس معنوی نظام پوشیدہ ہے اس کے مقابل ایلچی کا لفظ اپنے معنیٰ و مفہوم کی روشنی میں انتہائی پست اور بے جہت معلوم ہوتا ہے۔ اس بند سے ذہن اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جب ایک نبی کی ذات بھی بے چارگی میں عام انسانوں کے برابر ٹھہری تو حق تعالیٰ نے انھیں کیسی بزرگی و برتری سے نوازا ہے۔ دوسری بات خلق خدا کس تصور میں ان کے قریب جائیگی اور رشد و ہدایت کا کام کیسے سرانجام پائیگا۔

دراصل یہ خیال عقیدۂ وہابیت کا ترجمان ہے جو رسولِ اعظم ﷺ کی تعظیم و تکریم اور عظمت و رفعت کا معیار یہی رکھتا ہے کہ حضور ﷺ ہمارے بڑے بھائی کی طرح ہیں انکی عزت اور تعظیم ویسی ہی کرنی چاہیئے جیسا کہ ایک بڑے بھائی کی ہوتی ہے یا گاؤں کے چودھری کی نعوذ باللہ من ذالک

نعتیہ شاعری میں بشری پیکر کے تصورات میں بھی رسولِ اکرم ﷺ کو محض ایک ذات یا ایک شخصیت تک محدود نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ نعت میں جب تک شخصیت یا ذات اپنی تمام تر بشری عظمتوں کے ساتھ محبوبیت کے پیکرِ جمال میں محو نہیں ہوتی اسکا رنگ قصیدۂ شاہانہ تو ہو سکتا ہے مگر نعتیہ نہیں اس

طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں شخصیت کی تمام عظمتیں پہنچ کر تھک جاتی ہیں وہیں سے نبوت ورسالت کی عظمتوں ، رفعتوں اور فضیلتوں کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد محبوبیت کا جہانِ معانی نعت کا عرفانی ادب پیش کرتا ہے۔ لہذا جب نعت گوئی میں مداح اس نازک مقام سے گزرے تو ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھے کہ اس تصورِ بشریت اور نظریۂ عبدیت کو قرآن نے کس اہتمام سے بیان کیا ہے۔ اس بحث کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ نعت گوئی میں تصورِ انسان سے متعلق جمال پانی پتی نے نعت رنگ (کراچی) کے شمارے میں بہت نفیس بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"آپ کی نوری جہت ہو یا بشری دونوں ہی برحق ہیں اور دونوں ہی نعت کا موضوع بن سکتا ہے۔"

حالی کے بارے میں سید حسن عسکری کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ "اتنی بات ضرور ہے کہ اس نظم کے نعتیہ اشعار میں حضور نبی کریم ﷺ کی بشریت اور عبدیت کا رنگ ایسا غالب ہے کہ یقین نہیں آتا، کہ حالی جیسا آدمی رسولِ کریم ﷺ کو عام انسانوں کی سطح پر لاکر خود آپکی زبانِ مبارک سے بزرگی اور بے چارگی کا اعتراف اس طرح بھی کرا سکتا ہے"

چند سطور کے بعد لکھتے ہیں۔

"جو لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اردو میں نعت گوئی حالی کے مسدس کے برابر نہیں انھوں نے غالباً اس بات پر غور نہیں کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بے مثل بشریت اور عبدیتِ کاملہ کو ہم آپ جیسے عام انسانوں کی سطح کے برابر لانے سے نعت گوئی کا حق ادا کرنا تو درکنار خود ایمان کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اسی طرح جہاں آپ ﷺ کو آپ کے مرتبے سے بڑھانا الوہیت کے درجے پر فائز کرنا شرک ہے وہیں آپ کو آپ کے مرتبے سے گرانا بھی تو نقصِ ایمانی کی دلیل ہے

ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مدّاحِ رسول کی نگاہ میں بشریّت اور نورانیت دونوں تصورات کا بیک وقت رہنا ضروری ہے، پھر تصورِ نورانیت میں جہاں نوری مخلوق کی بات

سامنے آئے وہاں حضور کی نورانیّت کو اصل اور باقی کو فرع سمجھتے ہوئے فضائل کے گوشے کو رقم کرنے کی کوشش کرے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے نور سے تمام مخلوقات کو وجود بخشا اس لئے ہمارے حصّے میں جو کچھ ہے وہ نورِ مصطفائی کا صدقہ ہے اس طرح صرف بشریّت ہی نہیں بلکہ ملکوتیّت بھی نورِ مصطفائی کے پرتوِ جمال وکمال ہوئے ،صرف نورانیّت کا عقیدہ رکھنا اور محض بشریّت کے عقیدے کا اظہار کرنا اور ایک دوسرے کی نفی کرنا یہ دونوں صورتیں گمراہیّت کی طرف لے جانے والی ہیں اہلِ سنّت و جماعت کے نزدیک نوری بشر کا عقیدہ تمام افراط وتفریط سے عقیدے کو محفوظ رکھتا ہے۔ جہاں بشریّتِ عامہ اور بشریّتِ عظمہ کے فرق وامتیاز کے ساتھ فلسفۂ عبدیّت اور جلوۂ نورانیّت ومحبوبیّت موجود ہوں وہاں حقیقتِ محمدی کے لمعات عکس ریز ہوتے ہیں یہی نعت گوئی کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔حضورعلیہ ﷺ کو محض بشریّت کے دائرے میں دیکھنا ایک گمراہ کن منزل ہے کیوں کہ ہر یاقوت پتھر تو ہے مگر عام پتھر کی طرح نہیں حضور کی بے مثل وبے مثال بشریّت اور ہماری تمہاری بشریّت میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔

دھوکے میں آنہ جائے کہیں فکر وآگہی ـــ آقائے کائنات لباسِ بشر میں ہے
خدا خود نور قرآں نور محبوبِ خدا نوری ـــ خدا جانے یہ نوری سلسلہ پہنچا کہاں تک ہے

☆☆

محبوبیت کا اظہار

اَھلِ اِیمَان کا اس مسلمہ امر پر اتفاق ہے کہ حضور خالق دو جہاں کے محبوب ہیں چنانچہ محبوب و محبّ کے تصور کو مختلف انداز میں شعراء نے نظم کیا ہے۔نعتیہ شاعری کے مخصوص دائرے میں محبوبیت کے متعلق کیا طرزِ سخن اختیار کیا جائے جس میں شرعی نقائص نہ ہوں۔ان باتوں کو سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے نعتیہ شاعری میں محبوبیت کے مختلف رنگ و آہنگ ملتے ہیں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشیں کرلیں۔کہ (۱)حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات تمام مخلوقات میں سب سے بزرگ و برتر ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندے کے لئے شبِ معراج میں فرمایا "اتخذتک حبیباً" (میں نے آپ کو اپنا محبوب بنایا)اس طرح نعت میں اللہ کے لئے محبّ کا لفظ استعمال ہونے لگا۔حتیٰ کہ اس ضمن میں ہمارے شعراء اللہ و رسول کے لئے عاشق و معشوق کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔مثلاً

(۱) خدا بھی حسینوں کو رکھتا ہے دوست...... محمد سا محبوب اس کا ہے دوست

(۲) نبی پر ہوا حسن کا اختتام ...... کہ معشوقِ خالق تھے خیر الانام (بیخود لکھنوی)

(۳) کیا معشوق ہو کر اس نے طے عشق ...... کہ اس کو عشق ہے اور عشق ہے عشق

(۴) وہی تصدیق صادق اور وہی عشق ...... وہی معشوق، عاشق اور وہی عشق (نواب محبت خاں)

(۵) محمد کا اعزاز اللہ اکبر ...... خدا اور بندے کے خود ناز اٹھائے (خمار بارہ بنکوی)

(۶) ہوس تھی دید کی معراج کا بہانہ تھا..... اسے تو عرش پہ محبوب کو بلانا تھا (نامعلوم)

(۷) ایک دن عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا..... ہجر کا غم تو خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا (ہمایوں میاں بر.جی)

اب ایک سوال ابھرتا ہے کہ آخر یہ محبوبیت اور تصورِ حبیبیت کیا ہے؟ کیا ہم دنیوی عشق و محبت پر محمول کر کے پیش کر سکتے ہیں؟ میرا جواب ہوگا اللہ اور اس کے رسول کے لئے مجازی پیمانے میں محبوبیت کا اظہار کرنا قطعی مناسب نہیں کیونکہ اس رویئے میں حدِّ اعتدال قائم رکھنا بیحد دشوار کام ہے،نعتیہ شاعری میں محبت والفت کے حوالے سے بعض متعینہ جہتیں ہیں جنکے دائرے میں کچھ مخصوص صورتیں، انداز اور قرینے سامنے آتے ہیں۔اگر بغور دیکھا جائے تو نعتیہ شاعری میں عشق والفت کے حوالے سے

بعض متعینہ اسلوبِ بیان اور اندازِ فکر ونظر ہمیں قرآن واحادیث اور احکامِ شریعت کے اجالے میں دستیاب ہوتے ہیں۔عرفائے کاملین کی عارفانہ نگاہ میں محبوب ومحبّ کے تصوّرات وخیالات کی مختلف جہتیں ہیں اگر وہ ایک طرف محبوبِ حقیقی کا تصوّر رکھتے ہیں تو دوسری طرف محبِ حقیقی کا نظریہ بھی۔اس کا دوسرا پہلو ان کی نگاہ میں ذاتِ باری تعالیٰ جو وحدہ لاشریک ہے وہ محبوب بھی ہے اور محبّ بھی جو ہر طرح کے تجسیمی پیکر سے پاک ہے۔اسی نہج پر اگر دیکھا جائے تو رسولِ خدا بذاتِ خود خدا کے محبوب بھی ہیں اور محبّ بھی،اور دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو ذاتِ باری تعالیٰ نگاہِ نبوت ورسالت میں محبوب بھی ہے اور محبّ بھی،مگر ان سب کی حیثیت ونوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔خدا نے اگر محبوب وحبیب بنایا تو رسول کو ایسا مقام بخشا کہ ،بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، کا عنوان بن گیا،دوسری طرف رسولِ خدا نے وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں نیازِ عبدیت کی ایسی مثال قائم کی جس کا تصوّر کرنا بھی محال ہے۔

دراصل محبوبیت کا معنیٰ تمام نبیوں اور رسولوں پر نبیِ آخر الزماں کی افضلیت ہے۔جب ہم خصائصِ مصطفےٰ کا بیان کرتے ہیں اور امتیازی درجات کی مثالیں بطورِ علامت پیش کرتے ہیں تو محبوبیت کا تصوّر نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے ان گوشوں کے علاوہ اور بھی بہت سے نازک پہلو ہیں جس پر مفصل طور پر گفتگو کے لئے ایک دفتر چاہئے۔میری مدعا صرف یہ ہے کہ ہر منزل پر ہمیں احتیاط کی روش پر قائم رہنا ہے خاص طور پر اللہ ورسول کے درمیان حبیب ومحبوب کے تصوّر میں،یہاں ذرّہ برابر چوک ہمیں کفر کے دہانے پر پہنچا سکتی ہے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ نعتیہ شاعری میں تصوّرِ محبوبیت کے مختلف پہلو ہیں کچھ گوشے اوپر بیان کر چکا ہوں اب ذرا اس رخ سے بھی ملاحظہ کریں۔امت کے لئے رسول کی محبت جانِ ایمان ہے دوسری طرف بطورِ احسان نبی نے اپنی امت کو بیحد عزیز رکھا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقامِ محبوبیت اس کے بعد منزلِ محبّ پر فائز ہونا۔ان دو پہلوؤں کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بے پناہ محبت اپنی امت کے لئے اور امت کا نیاز وعشق اپنے نبیِ کریم کے لئے دو روشن پہلو نعتیہ شاعری میں نظر آتے ہیں۔ان سب کی روشن مثالیں قرآن واحادیث اور اصحابِ رسول کی سیرت کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔ان گوشوں پر اگر الگ الگ لکھا جائے تو کئی کتابیں مرتب ہو جائیں گی۔رسول ﷺ سے محبت اُمت کے لئے ضروری ہے یہی ایمان کی معراج ہے اور اس کا بہتر صورت میں اظہار کرنا ثواب مگر

شرط یہ ہے کہ تضادِ شعر و شریعت نہ ہو۔ اللہ کے لئے معشوق اور نبی کے لئے عاشق وغیرہ لکھنا سخت منع ہے
کیوں کہ نعت اور غزل کے محبوب میں عظیم فرق ہے۔

علامہ شمس بریلوی رقمطراز ہیں ''نعت سرور کونین ﷺ میں طرز ادا کی رنگینی کے اظہار کے لئے میدان بہت تنگ ہے۔ وہاں نہ مبالغہ کی گنجائش ہے اور نہ اغراق و غلو کی۔ وہاں شوخی کا گذر ہے اور نہ بیبا کی کا دخل، نہ معشوق کا جور و ستم ہے کہ اس کے نت نئے مضامین کیجئے اور نہ بوسہ و کنار کا گذر ہے۔ ہجر و فراق کی کیفیات ضرور ہیں لیکن ہجر و فراق کی وہ واردات نہیں جو تغزل کے لئے مخصوص ہیں بلکہ بہت محدود جہاں قدم قدم پر ادب کے پہرے دار ہیں اور اسلامی احکام کے نقیب کھڑے ہیں ذرا سی لغزش اعمال حسنہ کی تباہی کا نتیجہ بن جاتی ہیں اور ادنیٰ سی بے راہ روی دارین کی روسیاہی کا موجب اور معمولی سے معمولی بیبا کی آخرت کی تباہی کا پیش خیمہ، پس اِن حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے اگر کسی نعت نگار کا خامہ زبان کی سادگی کا لطف اور طرز ادا کی رنگینی کو پیش کردے تو یہ اس کی نعت گوئی کا ایسا رُخ ہے جس کو اس کا منتہائے کمال کہنا چاہئے۔'' (حدائق بخشش، تحقیقی و ادبی جائزہ)

حدائقِ بخشش کے دوسرے عظیم المرتبت شارح علامہ محمد فیض احمد اویسی نے محبوب و محبّ کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے۔ حاجی امداد اللہ مکی رحمتہ اللہ علیہ نے گلزارِ معرفت میں کہا کہ؛

خدا عاشق تمہارا اور ہو محبوب تم اس کے...... ہے ایسا مرتبہ کس کا سنا ؤ یا رسول اللہ

ان کے تتبع میں دیوبندیوں کے مولوی محمد قاسم نے قصیدہ قاسمیہ میں لکھا ۔

خدا تیرا اور تو خدا کا حبیب اور محبوب .... خدا ہے آپ کا عاشق تم اس کے عاشق زار

جیسا کہ اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ پر عاشق و معشوق کا اطلاق ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس لفظ کے اطلاق کا غلبہ قبیح عشق والوں کے لئے عام ہے۔ اسی لئے جس لفظ کا عرف عام میں قبیح اشیاء پر اطلاق ہوتا ہے وہ اللہ و رسول جل جلالہ و ﷺ کے لئے ناجائز ہے لیکن افسوس آج کل کے جاہل شعراء ذات وحدہٗ لاشریک پر اس کا اطلاق اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ اور مذکورہ دونوں اشعار میں آجانا حجت نہیں یہ ان کا سہو اور خطا ہے ☆☆☆

مبالغہ کی شدید ممانعت

شعر و ادب میں صنائع معنوی یا بلاغت کے تحت کلام کی وہ خوبیاں جن سے معنی اور خیال میں جاذبیت اور حسن و دلکشی پیدا کی جاتی ہے۔ان میں مبالغہ طرازی کو بڑا دخل ہوتا ہے۔فنکار جب کسی شئے کی حقیقت کا ادراک کرنا چاہتا ہے تو اسے مبالغہ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض ثابت شدہ چیزیں اس کے کلام کی روشنی میں دورازکار نظر آنے لگتی ہیں۔اور اس پر کذب بیانی کا الزام عائد ہو جاتا ہے۔اسی لئے بعض ناقدین نے مبالغہ کو حقیقت و صداقت کے برعکس قرار دیا ہے اس کے باوجود مبالغہ کو شعروادب میں ایک اہم درجہ حاصل ہے کیونکہ بیشتر ناقدین کا خیال ہے کہ مبالغہ کا عمل انسانی فطرت میں داخل ہے اور شعراء کے فکری وجذباتی اظہار کو حسن و جاذبیت سے ہمکنار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے مبالغہ کے سلسلے میں دنیائے ادب میں اختلاف ہونے کے باوجود اس کے مختلف درجات بھی بیان کر دئے گئے ہیں جو تین صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(الف) تبلیغ :- کسی چیز کو حد سے زیادہ بڑھا کر بیان کرنا جو عقلاً و عادتاً ممکن ہو اسے تبلیغ بھی کہتے ہیں۔

(ب) اغراق :- کسی شئے کا ذکر مبالغہ سے کرنا جو عقلاً ممکن ہو لیکن عادتاً محال ہو اسے استغراق بھی کہتے ہیں

(ج) غلو :- غلو یہ ہے کہ مبالغہ اس طرح کرنا جو عقلاً و عادتاً ہر دو اعتبار سے ممکن نہ ہو۔

یہ خانہ بندی مجازی شعروادب کے لئے اہم ہو سکتے ہیں مگر ممدوحِ کبریا ﷺ کی تعریف وتوصیف کے لئے میزانِ فکر وشعور نہیں بن سکتی۔کیونکہ شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک مبالغہ کا تصور ہی مختلف ہے۔ایک طرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت تو دوسری جانب نبیٔ دوجہاں ﷺ کی رسالت ونبوّت کا واضح تصور وعقیدہ ہے نہ الوہیت میں ربّ العالمین کا کوئی جواب اور نہ رسالت میں رحمت اللعالمین کی کوئی مثال۔لیکن ایک خالق ہے دوسرا مخلوق ایک رازق ہے دوسرا مرزوق ایک معبود ہے تو دوسرا عبد ایک محب ہے دوسرا محبوب۔ایسی صورت میں مبالغہ کا تصور ہی محال ہو جاتا ہے کیونکہ مبالغہ کی

اصل تعریف یہی ہے کہ کسی چیز کو حد سے بڑھا دینا۔اب عظمتِ رسالت کے مقابل شانِ الوہیت کو ہی مبالغہ کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے اس لئے شانِ رسالت میں مبالغہ آرائی کی کوئی گنجائش نہیں۔

نعت گوئی میں مبالغہ سے بچنے کی جو ہدایت کی گئی ہے وہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہے۔ حدیثِ پاک ہے "مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسا کہ نصاریٰ نے حضرتِ عیسیٰ بن مریم کو بڑھا دیا" اس حدیثِ پاک سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وحدانیت ورسالت میں فرق وامتیاز کے حدود کو قائم رکھنا ایک مومن کے لئے لازمی ہے۔اس بات سے بھی اختلاف ممکن نہیں کہ نعتیہ شاعری میں مداحی خواہ وفورِ شوق وجذبات میں ہی کیوں نہ ہو اگر شرعی اصول وقوانین سے ذرّہ برابر تجاوز ہو جائے تو بجائے ثواب کے ذریعۂ عذاب ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں ان باتوں کو بھی نگاہوں میں رکھنا ضروری ہے جن کے سبب پچھلی امتیں عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو چکی ہیں۔اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انبیائے کرام کی تعریف میں غلو کی کیا صورتیں ہیں۔ایک ناقد نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ "انبیائے کرام کی تعریف میں غلو کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) رسالت کی الوہیت کا عقیدہ (۲) نبوت کی ابنیت کا عقیدہ (رسول وانبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو ثالث ثلاثہ یعنی تثلیث کا مصداق ماننا قرآنِ کریم میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے پرستار عیسائیوں کے مذکورہ بالا اعتقاد کا شدید انداز میں ردّ موجود ہے۔سورۂ مائدہ شریف میں ہے "لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ" (بے شک وہ کافر ہو گیا جس نے کہا اللہ تو تین کا تیسرا ہے) اسی آیتِ کریمہ میں ارشاد ہے "قالت الیھود والنصاریٰ نحن ابنآءُ اللہ واحبّائُہٗ" (یعنی یہود ونصاریٰ نے کہا ہم تو اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں) (معاذ اللہ) ان عقیدوں کے بیان کے بعد اسی سورۂ مبارکہ میں ارشادِ ربانی ہے "یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق" (یعنی اے اہلِ حق دین میں ناحق غلو نہ کرو) معلوم ہوا کہ کسی مخلوق کے بارے میں غلو کے وہی تین امور ہیں۔جس مدح وثنا میں یہ باتیں نہ ہوں وہ غلو سے پاک ہیں انبیائے کرام کے فضائل ومناقب ومعجزات وکمالات اور صفات لاکھ محیر العقول ہوں مگر بیان کرنا غلو نہیں بلکہ قرآنی سنت ہے۔

حضرتِ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے قصیدہ بردہ شریف میں فرمایا ہے۔

دع ما ادعته النصاریٰ فی نبیهم
واحکم بما شئت مدحا فیه محتکم

"یعنی نصاریٰ نے اپنے نبی کے متعلق جن کفری عقیدوں کا دعویٰ کیا ہے اے مسلمان اپنے رسولِ پاک کے حق میں ان کفری وشرکی دعوؤں کو قطعاترک کردے اس کے سواحضور کی شانِ کریم میں جو بھی فضل وکمال جو بھی علمی وعملی وسعتیں وبلندیاں ذہن وتصور میں آسکیں ثابت کرو۔نظماونثرابیان کرو اس اثبات وبیان میں تم حق بجانب ہوگے"

اس کے باوجود شعراء کی بے محابا جسارت کو لگام دینے کے لئے رسولِ کریم ﷺ کی واضح ہدایات کافی ہیں "ایاکم والغلو فانها اهلک من کان قبلکم الغلو "خبردار!غلو سے بچے رہنا۔تم سے پہلے بہت سوں کو غلو نے برباد کیا"انی لا ارید أن ترفعونی فوق نزلتی التی انزلینها اللّٰہ تعالیٰ.انا محمد بن عبداللّٰه عبده ورسوله " بے شک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤتم مجھکو زیادہ اس مرتبہ سے جواللہ نے مجھے بخشاہے میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبداللہ کا،اللہ کا بندہ اوراسکارسول۔

مذکورہ بیان کے پیشِ نظر بعض شعراءان ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جومبالغہ کی بدترین مثالیں ہیں حتیٰ کہ بعض اشعار خالص کلام کفر معلوم ہوتے ہیں اورشاعرحریم اسلام سے بہت دورنکلتا ہوادکھائی دیتاہے۔

محمد نے خدائی کی ، خدانے مصطفائی کی
کوئی سمجھے تو کیا سمجھے،کوئی جانے تو کیا جانے

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لینگے محمد سے

خدائے پاک کوئی اب نئی زمیں ڈھونڈھے
کہ اس محیط پر جنت نشاں حجاز ہوا

ہے خداکو جس قدراپنی خدائی پر گھمنڈ
اس قدر ہے مصطفےٰ کومصطفائی پر گھمنڈ

انسانیت کوبخشی وہ معراج آپ نے
ہرآدمی سمجھنے لگا ہے خدا ہوں میں

عقل کہتی ہے مِثْلنا کہیے
عشق بے تاب ہے خدا کہیے

☆☆☆

نبی رحمت ﷺ اور انبیائے سابقین کا تقابل

نعت گوئی میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جب حضور سیدِ کونین ﷺ کی شان وعظمت کے پیشِ نظر دیگر انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے مخصوص فضائل وکمالات اور معجزات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں موازنہ اور تقابل کا رنگ دیکھا جاتا ہے اس سلسلے میں چند باتیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئیں۔ پہلی بات یہ کہ رسولوں میں فرق پیدا کرنا جائز نہیں یعنی تمام انبیاء ومرسلین پر ایمان لانا لازمی ہے ان کی تعظیم وتوقیر کرنا عینِ ایمان ہے۔ ان کے درجات وفضائل کو اس طرح بیان کرنا کہ تنقیص وتوہین کا کوئی گوشہ نکل پڑے یہ شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک کفر ہے۔ ایک حدیثِ پاک میں رسولِ کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں ''مجھے یونس علیہ السلام پر بھی بزرگی نہ دو'' مطلب یہ ہے کہ اس انداز سے تعریف وتوصیف رسولِ کریم ﷺ پسند نہیں فرماتے کہ ایک طرف تعریف ہو اور دوسری جانب تنقیص ہو جائے۔

جہاں تک رسولِ پاک ﷺ کی عظمت وبزرگی کا سوال ہے تو اسکے متعلق بہت سی حدیثیں وارد ہیں۔ اور قرآن میں بھی ارشاد ہے ''تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض منھم من کلم اللّٰہ ورفع بعضھم درجات'' (یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی ہے ان میں سے وہی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض وہ ہیں جنھیں درجوں بلند کیا) اس فرمانِ عالیہ کو سامنے رکھیں اور اس حدیثِ مقدسہ کو دیکھیں جس میں حضور ﷺ نے اپنی پانچ خصوصیات کو بیان فرمایا ہے۔ صحیحین میں حضرتِ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ (۱) ابھی ایک ماہ کی مسافت باقی رہتی ہے کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے (۲) ساری زمین میرے لئے مسجد اور پاکیزہ بنا دی گئی ہے جو جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے (۳) غنیمت کا مال میرے لئے حلال کر دیا گیا ہے جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا (۴) مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے (۵) پہلے نبی اپنی امت کے لئے خاص ہوا کرتے تھے مگر میں ساری دنیا کے لئے نبی ہو کر آیا ہوں''۔

مذکورہ ارشادات کی روشنی میں یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جب نعت گوئی میں کوئی ایسی صورت سامنے آجائے تو ایک مدحت نگار کو بڑی محتاط روی کے ساتھ گزرنا چاہیئے اور ہمہ وقت اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اس تقابلی طرزِ سخن میں برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کی شانِ اقدس میں حرف گیری نہ ہونے پائے بلکہ فضیلت و عظمت کی ایک روشن مثال ہی ثابت ہو۔ مثلاً فاضلِ بریلوی فرماتے ہیں۔

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں...... سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

ہر خطِ کف ہے یہاں اے دست بیضائے کلیم...... موجزن دریائے نورِ بے مثالی ہاتھ میں

کوچہ کوچہ میں مہکتی ہے یہاں بوئے قمیص...... یوسفستاں ہے ہر اک گوشۂ کنعانِ عرب

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں...... سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

علم لدنی، شان کریمی، خلق خلیلی، نطق کلیمی...... زہد مسیحا، عفت مریم صلی اللہ علیہ وسلم (اقبال سہیلی)

تھی صدا اس کی خلیل حق کے جذبوں کا فروغ...... کس کے حرف ولفظ تھے آواز اسماعیل میں (قاسم حبیبی برکاتی)

شاعری میں صنعتِ تلمیح کے تحت کسی مشہور تاریخی واقعہ یا قصہ کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ معجزات کے حوالے بھی اسی قبیل سے آتے ہیں اور حدیث پاک کا کوئی گوشہ یا قرآنی آیات کی طرف اشارہ بھی مقصود ہوتا ہے۔

اوپر جو مثالیں پیش کی گئیں ان میں انبیائے سابقین کی عظمتوں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اب کچھ ایسی بھی مثالیں دیکھ لیجئے جو آئینے کے دوسرے رُخ کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً معروف مثنوی نگار میر حسن کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مسیح اس کے خرگاہ کا پارہ دوز...... تجلی طور اس کی مشعل فروز

خلیل اس کے گلزار کا باغباں...... سلیماں سے کئی مہر دار اسکے یاں

خضر اس کی سرکار کا آبدار...... زرہ ساز داؤد سے واں ہزار

اسی طرح مرزا محمد رفیع سودا کا شعر

کرے ہمسری جو کسے ہے یہ تاب...... کہ نبیوں سے بڑھ کر بھی اُس کے صحاب

اسی طرح محسن کاکوروی کا شعر

مفت حاصل ہے مگر اس کی یہ تقدیر نہیں...... کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

طور کا جلوہ تھا جلوہ آپ کا...... لن ترانی تھی صدائے مصطفےٰ (نامعلوم)

اس مضمون کی مناسبت سے امام احمد رضا فاضلِ بریلوی کا ایک واقعہ پیش کرنا زیادہ مناسب ہے۔ایک بار ایک صاحب نے فاضلِ بریلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر نعتیہ اشعار سنانے کی اجازت چاہی آپ نے فرمایا میں حسن میاں یا حضرت کافی مرادآبادی کے کلام سنتا ہوں اس لئے کہ ان کا کلام میزانِ شریعت پر تُلا ہوتا ہے پھر خیالِ خاطرِ احباب کے پیشِ نظر شاعر موصوف کو اجازت مرحمت فرمائی ان کے کلام میں ایک مصرع تھا۔

شانِ یوسف جو گھٹی ہے تو اسی در سے گھٹی۔

آپ نے فوراً شاعرِ موصوف کو روک دیا اور فرمایا حضور ﷺ کسی نبی کی شان گھٹانے کے لئے تشریف نہیں لائے بلکہ انبیاء ومرسلین کی عظمت وبزرگی میں چار چاند لگانے کے لئے تشریف لائے اور مصرع یوں بدل دیا۔

شانِ یوسف جو بڑھی ہے تو اسی در سے بڑھی۔

حضور صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی اپنی مشہورِ زمانہ کتاب جسے فقہہ حنفیہ کا انسائیکلوپیڈیا کہا گیا ہے اس کتاب میں بطورِ عقیدہ بیان فرماتے ہیں

نبیوں کے مختلف درجے ہیں بعض کو بعض پر فضیلت ہے اور سب میں افضل ہمارے آقا ومولا سید المرسلین ﷺ ہیں حضور کے بعد (انبیا ومرسلین میں) سب سے بڑا مرتبہ خلیل اللہ علیہ اسلام کا ہے پھر حضرتِ موسیٰ علیہ اسلام پھر حضرتِ عیسیٰ علیہ اسلام اور حضرتِ نوح علیہ اسلام کا ان حضرات کو مرسلینِ اولوالعزم کہتے ہیں اور یہ پانچوں حضرات باقی تمام انبیا ومرسلین انس وملک وجن وجمیع مخلوقاتِ الٰہی سے افضل ہیں جس طرح حضور تمام رسولوں کے سردار اور سب سے افضل ہیں بلا تشبیہ حضور کے صدقے میں حضور کی امت تمام امتیوں سے افضل ہے (بہار شریعت حصہ اوّل صفحہ ۱۶)

میرے نزدیک انبیا ومرسلین کے فضائل ومراتب بیان کرنا اور ان کے شایانِ شان بیان کرنا بڑا مستحسن امر ہے جب حضور کی افضلیت ثابت شدہ حقیقت ہے تو پھر تقابل کا تصور کیسا؟ ☆☆

مقاماتِ مقدسہ کا تقابلی انداز

نعتیہ شاعری میں اکثر شعراء مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بطحیٰ وطیبہ، عرش وکرسی، لوح وقلم، سدرہ ولامکاں جیسے مقدس مقاماتِ جلیلہ کو اپنی نعتوں میں نظم کرتے ہیں۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ اکثر شعراء ان مقاماتِ مقدسہ کے متعلق جو عظمت وحُرمت کے احکام ہیں ان کو بغیر کسی معلومات کے محض خوبصورت الفاظ سمجھ کر استعمال کرتے چلے جاتے ہیں جس کے سبب عموماً بڑی بھیانک غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ مکہ شریف جلالتِ توحید کا مرکز ہے تو مدینہ منورہ جسے بطحیٰ وطیبہ کے ناموں سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ رحمت وانوار کا مخزن ہے۔ مکہ مکرّمہ میں سینہ تان کر چلنا عبادت ہے تو طیبہ شریف میں نفس گُم کردہ ہو جانا عین ایمان ہے۔ سدرہ جبریلِ امین کی منزل ہے تو عرشِ مبارک تجلیّاتِ الٰہیہ کی مخصوص جلوہ گاہ ہے۔ لامکاں وہ ہے جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے محبوبِ کونین ﷺ کو شبِ معراج شرفِ ملاقات سے نوازا۔ جنت اصطلاحِ شرع میں اُس عظیم الشان باغ کو کہتے ہیں جو بے شمار نعمتیں لئے ہوئے عالمِ آخرت میں اہلِ ایمان کے لئے مخصوص ہے۔ کوہِ طور وہ مقام ہے جہاں سے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کلام فرماتے تھے اور حضور کا روضۂ مبارک ایمان وعرفان کا مرکز ہے جہاں سے دارین کی سعادتیں اور نعمتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ بعض جلیل القدر علماء وفقہائے کرام کے نزدیک شہرِ مدینہ کی عظمت ورفعت تمام مقدس مقامات پر اس لئے مقدم ہے کہ روضۂ سرکارِ جانِ جاناں ﷺ اس خطۂ مبارک میں موجود ہے اس لئے مدحت نگار کے لئے ضروری ہے کہ تمام مقدس مقامات کی عظمت وبزرگی کو ملحوظ رکھے جیسا کہ فاضلِ بریلوی نے طیبہ وکعبہ کی عظمتوں کے اظہار وبیان میں انتہائی خوبصورت اندازِ سخن پیش فرمایا ہے۔

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو ...... کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

زینتِ کعبہ میں تھا لاکھ عروسوں کا بناؤ ...... جلوہ فرما یہاں کونین کا دولہا دیکھو

رقصِ بسمل کی بہاریں تو منیٰ میں دیکھیں ...... دلِ خوں نابہ فشاں کا بھی تڑپنا دیکھو

خوب آنکھوں سے لگایا ہے غلافِ کعبہ ...... قصرِ محبوب کے پردے کا بھی جلوہ دیکھو

آبِ زم زم تو پیا خوب بجھائیں پیاسیں ...... آؤ جودِ شہِ کوثر کا بھی دریا دیکھو

طیبہ نہ سہی افضل مکہ ہی بڑا زاہد ..... ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے

بعض شعراء مندرجہ مقامات کی عظمت کو فراموش کرتے ہوئے مدینہ منورہ کی عظمت بیان کرتے ہیں ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر مقام کی اپنی خصوصیت واہمیت ہے لہذا اندازِ تقابل میں محتاط روی کے ساتھ عظمتِ مدینہ اس پیرائے میں بیان کریں کہ ایک طرف عظمت بھی ثابت ہو جائے اور دوسری جانب دیگر مقامات کی بے توقیری سے بھی دامن بچ جائے۔

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی نے نعت رنگ شمارہ ۶ میں تحریر کرتے ہیں کہ "مدینہ سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے اردو نعت گو نے یہ بات بھی اپنے اوپر واجب کر لی ہے کہ مدینہ کا تقابل جنت سے کیا جائے اور جنت کا ذکر تحقیر سے کیا جائے۔۔۔ چند جملوں کے بعد۔۔۔ جنت کا یہ استخفاف قرآن ناشناسی بلکہ اسلامی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے اور سستی جذباتیت ہے،

اس والہانہ جذبۂ محبت کے اظہار کو سستی جذباتیت سے تعبیر کرنا گرچہ درست نہیں مگر جنت کا یوں استخفاف بھی درست نہیں، مثلاً

آئے نبی تو خلق قرینے میں آگئی .... جنت کنیز بن کے مدینے میں آگئی

نہیں ضرورت مجھے اے رضواں تو اپنی جنت سنبھال کر رکھ

ہزاروں جنت خرید لوں گا میں نعتِ سرور سنا سنا کر

نسبتِ رسول کے نام پر مدینہ منورہ بھی دل وجان سے عزیز ہے اور اسی حوالے سے جنت کا احترام بھی سر آنکھوں پر ہے۔ دنیا میں عاشقانِ رسول کی جنت مدینہ ہے جس نے رسول سے نسبت رکھنے والے تمام مقاماتِ مقدسہ کا احترام کیا وہی جنت کا مستحق ہوا

مدینہ جس نے دیکھا ہے وہ جب جائے گا جنت میں

کہے گا یہ جگہ دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے

☆☆☆

لفظِ یثرب کا استعمال ممنوع

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ جو شخص ایک بار یثرب کہے اسے اُسکے تدارک کے لئے دس بار مدینہ کہنا ہوگا دوسری روایت میں ہے کہ اس کو استغفار کرنا ہوگا بعض حضرات نے کہا کہ یثرب کہنے والے کو سزا دینی چاہئے۔

جب حدیثِ پاک میں مدینہ طیبہ کو یثرب کہنے کی ممانعت آئی ہے تو مدحت نگارانِ مصطفٰے کو یثرب لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کسی بزرگ کے شعر سے یہ جتانا کہ انھوں نے بھی استعمال کیا ہے شریعت میں جواز کے لئے کافی نہیں۔ جیسا کہ شیخ محقق نے ارشاد فرمایا ہے۔

"فرع کا اعتبار اسی وقت ہے جب وہ اصل اور قاعدہ کے مطابق ہو اور اصل قاعدہ کتاب وسنت ہے۔ پس کوئی قول خواہ وہ کسی بھی شخص کا ہو فقیہ یا متکلم یا صوفی کا اگر وہ اصل وقاعدہ کے مطابق ہے تو مقبول ہے ورنہ اگر وہ اس قابل ہے کہ رد کر دیا جائے تو مردود ہے اور اس قابل ہے کہ تاویل کی جائے تو بہر طور تاویل کی جائے گی اور اگر اس لائق بھی نہیں تو قائل کے علم و دیانت میں کامل ہونے کے سبب اسے (متشابہ کی طرح) تسلیم کرلیا جائیگا۔ مگر بہر طور وہ قول اصل وقواعد کا مقابل ومعارض نہیں ہوگا۔

مولانا ڈاکٹر سید شمیم گوہر لکھتے ہیں "بعض شعرائے متقدمین کی طرح لفظ یثرب کا استعمال امیر نے بھی کیا ہے جب کہ سختی سے پرہیز کرنا چاہئے تھا۔ ہجرت کے بعد اللہ کے رسول علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اس کا نام طیبہ رکھا اور یثرب جیسے منحوس نام کے لکھنے بولنے کو منع فرمایا۔ ایسا لگتا ہے کہ اکثر شعراء اِس تنبیہ وتاکید سے لاعلم رہے ہیں ورنہ قصداً ایسی غلطی کی امید سمجھ میں نہیں آتی۔ لاعلمی ہی کی بنیاد پر یہی غلطی شہیدی، لطف، محسن کاکوروی اور ڈاکٹر اقبال سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ واضح ہو کہ یثرب اور طیبہ کا ایک ہی وزن ہے لہٰذا قارئین کو یثرب کی جگہ ہمیشہ طیبہ ہی پڑھنا چاہئے۔ شرعی اور اعتقادی نکتۂ نظر سے چونکہ یہ تحریف وتبدیلی جائز ومستحسن ہے اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ (نعت کے چند شعرائے متقدمین صفحہ ۸۳)

اسم ذات کے ساتھ ندا کی ممانعت

علمائے کرام وفقہائے دین متین ارشاد فرماتے ہیں حضور سید کونین ﷺ کو پکارے تو نام پاک کے ساتھ ندا نہ کرے یعنی عام لوگوں کو جس طرح ان کا نام لے کر پکارا جاتا ہے۔اور کسی خاص ادب واحترام کا اہتمام نہیں کیا جاتا اس انداز میں نبی رحمت ﷺ کو ندا نہ کی جائے۔مثلاً پیارے حبیب کا اسم گرامی لے کر محض یا محمد (ﷺ) کہہ کر نہ پکارا جائے۔بلکہ ادب واحترام اور توقیر وتعظیم کے ساتھ آپ کے معظم القاب سے نرم آواز اور متواضعانہ ومنکسرانہ لہجہ میں یا نبی اللہ، یا رسول اللہ، یا حبیب اللہ کہنا چاہیئے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کا نام لے کر ندا کرنا حرام ہے۔رب قدیر نے دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کو ان کے ذاتی اسمائے مبارکہ سے پکارا مثلاً

''یا آدم، یا عیسیٰ، یا ابراھیم، یا ذکریا، یا یحییٰ، یا الیاس وغیرہ لیکن جب حبیب کو مخاطب فرمایا تو صفاتی اسمائے گرامی ہی کے ذریعے مثلاً...... یا ایھا المزمل، یا ایھا المدثر ،طٰہٰ، یٰس، رحمت للعالمین، سراجاً منیرا ﷺ کے حسین وجمیل القاب سے یاد فرمایا۔ان ہی نزاکتوں کے پیش نظر علمائے ربانین نے حرف ندا کو اسم ذاتی کیساتھ استعمال کرنا حرام قرار دیا ہے اور اسم ذاتی شریف کے استعمال پر یہ حکم دیا ہے کہ درود شریف کی مقدس فضا میں لیا جائے۔لہذا مدحت نگاروں کو ان باتوں کا مکمل لحاظ رکھنا چاہیئے۔اگر ضرورت شعری کے تحت اسم پاک کا استعمال کئے بغیر چارہ نہ ہو یا اسم ذاتی سے کسی اہم دلیل یا گوشہ مقصود ہو تو کوئی حرج نہیں۔

اردو کے بعض قدیم وجدید شعراء کے کلام میں اسم ذات کے ساتھ حرف ندا کا استعمال ناروا طور پر نظر آتا ہے جس کی ممانعت آئی ہے۔

(۱) یا محمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں...... خلق کو لازم ہے مجھکو تجھ پہ قربانی کرے (ولی دکنی)

(۲) یا محمد تھا کرم میں ہوں سدا امیدوار...... جلوۂ ایمان دے اور بھید کہہ انسان کا (سراج اورنگ آبادی)

(۳) سُنا ہے خاک کے پتلوں کی اس خاموش بستی میں ...... پکار اُٹھتا ہے اکثر یا محمد کوئی دیوانہ

اور بغیر حرفِ ندا کے اسمِ ذاتی کا استعمال بھی دیکھئے جس میں شرعی کوئی قباحت نہیں مگر اہل محبت کبھی کبھی اور کسی خاص نزاکت ہی کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

(۱) زہے عزت و اعتلائے محمد ...... کہ ہے عرشِ حق زیرِ پائے محمد

(۲) خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم ...... خدا چاہتا ہے رضائے محمد (رضا بریلوی)

(۳) قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے ...... دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے (علامہ اقبال)

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یا محمد کہہ کر حضور ﷺ کو مخاطب نہیں فرمایا لیکن یا محمد کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خطاب فرمایا۔ احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرمائے گا" "یا محمد ارفع رأسک" اے محمد ﷺ اپنا سر اُٹھایئے اختصامِ ملائکہ کی مشہور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے لئے لفظِ یا محمد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خطاب وارد ہے۔ بہ روایت معاذ بن جبل ؓ اس حدیث میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یا محمد" سرکار فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کیا "لبیک ربِّ" اے میرے رب میں حاضر ہوں۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۸۸ مطبع رشیدیہ دہلی) اس مقام پر عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ خدا ہے جسے اختیار ہے کہ وہ اپنے بندے سے جس انداز سے چاہے خطاب فرمائے ہم امتی ہیں ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ خدا کا فرمان ہے "لاتجعلوا دعاء الرسول کدعاءِ بعضکم بعضاً۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی ارشاد فرماتے ہیں "بجائے نام اقدس (محمد ﷺ) اسمائے صفاتی ہوں تو بہتر ہے۔ خصوصاً ندا کے وقت۔ مثلاً یا رسول اللہ، یا حبیب اللہ ضروری ہے۔ نام اقدس لے کر ندا حرام ہے اور غیر ندا میں بھی ساقی کوثر یا آفتاب رسالت، شفیع المذنبین کہنا اور لکھنا چاہئے۔ (حیات اعلیٰ حضرت اول صفحہ ۳۵۰، مصنف ملک العلماء محمد ظفر الدین بہاری، ترتیب جدید مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی)

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ...... ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

☆☆☆

ذم کا پہلو

شعر وسخن میں ذم کوایک نمایاں مقام حاصل ہے۔جس میں کسی شخص کی مذمت اور برائی ادبی پیرائے میں بیان کی جاتی ہے۔دراصل یہ بھی ہجو کی ایک شاخ ہے مگر ذم میں صرف مذمت ہوتی ہے اور ہجو میں اصلاح جس سے تذلیل وتحقیر منظور نہیں۔ذم کی دوصورتیں ہیں۔

مدح بلباسِ ذم :- (تاکید مدح بالفظ مشابہ ذم) مدح میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا کہ ظاہر میں ہجو مگر باطن میں تعریف پر دلالت کرتا ہو مثلاً

تو بڑا جابر ہے لیکن سرکشوں کے واسطے...... تو بڑا ظالم ہے لیکن ظالموں کے واسطے

ممدوح کو ظالم اور جابر کہنا خراشندہ الفاظ ہیں لیکن سرکشوں اور ظالموں کی طرف رُخ موڑ کر وہی ناموزوں الفاظ معنوی طور پر کلمۂ تحسین بن گئے ہیں یہ پیرایۂ سخن نعت گوئی میں اختیار کرنے میں زیادہ امکان ہے کہ قلم چوک جائے اس لئے علمائے کرام نے منع فرمایا ہے اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ نعت گوئی میں مدحِ رسول کے لئے ایسے الفاظ کو استعمال نہیں کرنا چاہئے جو نازیبا ہوں۔

ذم بلباسِ مدح :- (تاکید ذم بالفظ مشابہ بہ ذم) ظاہر میں تعریف مگر باطن میں ہجو۔صنعتِ ماقبل کے بالکل برعکس ہے۔مثلاً

پھر آج میر مسجدِ جامع کے تھے امام...... داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

پہلے مصرعہ میں مدح ہے اور دوسرے مصرعہ نے اس کو ہجو بنا دیا ہے۔

مذکورہ ذم کی صنعت عام شاعری میں خواہ کوئی بھی درجہ رکھتی ہو مگر نعتیہ شاعری میں اس صنعت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔حالانکہ رسولِ کونین ﷺ کے گستاخوں کے لئے اس صنعت سے کام لیا جائے تو کامیابی کا تصوّر محال نہیں رہ جاتا۔

☆☆☆

اصلاحِ فکرونظر کا ایک خاص پہلو

تاریخ شعر و ادب میں ہجونگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ مدح کے برعکس ہجو کو بھی ادب میں ایک صنف کا درجہ دیا گیا ہے۔ ہجو میں کسی خاص شخص کی مذمت کرتے ہیں۔ اس کا کمینہ پن، بدکرداری وبدفعلی، بدعہدی وسفلہ مزاجی، ترش روی وبدکلامی، حسب ونسب کی خرابی اور جہالت وخباثت غرض تمام معائب کا ذکر ہجو میں روا رکھا گیا۔ چونکہ ہجونگاری ایک دشوار اور نازک فن ہے لہٰذا جب شاعر کسی سے رنجیدہ ہوکر مذمت کرنے پر کمربستہ ہوتا ہے تو اسے بہر نوع ادب وتہذیب کے دائرے میں رہ کر ہی اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ وہ اشارے اور کنائے کی زبان میں کچھ اس انداز سے قلم کو شمشیر بناتا ہے کہ اسکا دشمن صرف کسمسا کر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ زبان پر آہ تک نہیں لاسکتا۔

نعتیہ شاعری میں مذمت کے جو اشعار ملتے ہیں اگر اسکی نوعیت وانفرادیت اور نعت گوئی میں اس کی روایت تلاش کی جائے تو یقینی طور پر کتاب وسنت کے عین مطابق پائینگے۔ قرآنِ کریم میں کفار ومشرکین کی ربُّ العزت نے کس قدر بلیغ تنقید فرمائی ہے۔ ایک دن مشہور گستاخ ولید ابن مغیرہ نے محبوبِ ربُّ العالمین ﷺ کی دلخراش گستاخی کرتے ہوئے کہا "یا ایھا الذی نزل علیک الذکر انک لمجنون " یعنی اے وہ شخص کہ جس پر قرآن آتا ہے وہ تو مجنون ودیوانہ ہے" بس اتنا کہنا تھا کہ قہرالٰہی اُمنڈ پڑا اور غیظ وجلال میں ڈوبی ہوئی آیتیں ابن مغیرہ کی مذمت میں نازل ہوئیں۔

"قسم ہے قلم کی اور اسکے نوشتوں کی کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں اور یقیناً آپ کے لئے بے پایاں اجر وثواب ہے اور بلاشبہ آپ کی خوبڑی شان کی ہے پس عنقریب آپ بھی ملاحظہ فرمائینگے اور وہ بھی دیکھ لینگے کہ دیوانہ کون ہے" ۱

قرآنِ حکیم نے ولید ابن مغیرہ کی مذمت میں کس قدر غضب ناک انداز اختیار فرمایا ہے "(اے محبوب) آپ کسی بھی ایسے شخص کی بات مت سنئے جو بڑا قسمیں کھانے والا ذلیل، بہت بڑا طعنہ باز، بہت بڑا متفنی، بھلائی سے بہت زیادہ روکنے والا، حد سے گزرا ہوا، درشت خو اور اس پر طرہ

یہ کہ ولد الحرام ہے۔ مزید برآں مال واولاد والا ہے جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلوں کے قصے ہیں۔ عنقریب ہم اسکی سور جیسی تھوتھنی پر داغ دینگے'' ۲

علاوہ ازیں احادیث کریمہ میں براہ راست شعرائے اسلام کو رسول کریم نے حکم فرمایا۔ جیسا کہ روایتوں میں ارشاد ہے کہ ایک موقع پر رحمت تمام ﷺ نے اپنے محبوب شاعر حضرت کعب بن زہیر سے فرمایا کہ

''ان کی (یعنی کفار ومشرکین) ہجو میں شعر کہو کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تمہارا شعران کے حق میں تیر سے زیادہ کارگر ہوتا ہے'' ۳

نعتیہ شاعری میں رسول ہاشمی ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مداحانِ رسالت نے تین طریقوں سے مذمت یا ہجو کئے ہیں۔ پہلا طرزِ اظہار یہ ہے کہ محبوب کی مدح سرائی براہِ راست کی جائے دوسرا طرزِ ادا یہ ہے کہ محبوب جسے محبوب رکھتا ہے اس سے اپنی محبوبیت کا اظہار کیا جائے۔ اور تیسرا پیرایۂ سخن یہ ہے کہ محبوب نے جن چیزوں کو ناپسند کیا اور جو محبوب کے بدخواہ اور دشمن وگستاخ ہیں قرآنی اصول کے مطابق انکی گرفت کی جائے گویا ان میں دو طریقے اسلوب وبیان کے مطابق بالواسطہ مذمت کرتے ہیں اور ایک طریقہ براہِ راست ہجو کا ہے اس طرح اگر دیکھا جائے تو شعرائے اسلام نے ان تینوں طریقوں سے ہمیشہ سخنوری کی ہے نعتیہ شاعری میں جہاں کفار ومشرکین کے عقائد باطلہ کی زبردست نقاب کشائی کی جاتی ہے وہیں بدعمل اور بے عمل مسلمانوں کی بے راہ روی اور کوتاہیوں پر بھی کمالِ صحت کے ساتھ تنقید کی جاتی ہے تاکہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی زندگی بسر کریں اور دارین کی نعمتوں سے سرفراز ہوجائیں۔ اسی کے ساتھ نعتیہ شاعری میں محاسبۂ نفس سے متعلق بھی اشعار کہے جاتے ہیں۔ تاکہ ذاتی زندگی کے مخفی حالات وکیفیات بھی نعتیہ موضوع بن جائیں اور کائنات کے مسائل کے ساتھ ساتھ مداح کی ذاتی زندگی کا عکس بھی نعت رسول کے دائرے میں سمٹ آئے۔ اس طرح نعتیہ شاعری میں حب رسول، سیرت رسول اور احکام رسول کی پیروی کے حسین جلوے نکھر کر سامنے آئینگے اور آفاقیت سے ہمکنار ہونگے۔ ان گوشوں سے متعلق چند اشعار بطورِ مثال امام احمد رضا کے پیش کئے جاتے ہیں۔

دشمنِ احمد پہ شدّت کیجئے ..... ملحدوں کی کیا مروّت کیجئے

ترا کھائیں تیرے غلاموں سے الجھیں..... ہیں منکر عجب کھانے غرّانے والے

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار.....اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

وہ رضا کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے

کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ یہ وار وار سے پار ہے

خاک ہو جائیں عدو جل کر مگر ہم تو رضا

دم میں جب تک دم ہے ذکر ان کا سناتے جائیں گے

حشر تک ڈالیں گے ہم پیدائشِ مولا کی دھوم

مثلِ فارس نجد کے قلعے گراتے جائیں گے

اس طرح کی سینکڑوں مثالیں حدائقِ بخشش سے پیش کی جاسکتی ہیں موجودہ عہد کے بعض ناقدینِ ادب معترض نظر آتے ہیں کہ نعتیہ شاعری میں صرف رسول کی تعریف ہونی چاہئے اس میں کسی مخصوص فرقے سے اعتقادی اختلاف بیان کرنا غیر ضروری ہے اس سلسلے میں میرا واضح موقف وہی ہے جسے میں گزشتہ صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ دراصل قرآن واحادیث کے صریح احکامات اور اعتقادی مسائل سے ناواقفیت کے سبب صلح کلیت رکھنے والے لوگ یا وہ بے علم لوگ جو دشمنانِ مصطفےٰ اور عاشقانِ مصطفےٰ کے درمیان حدِّ امتیاز نہیں رکھتے اور سب دھان بائیس پسیری سمجھتے ہیں اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ شخصیت پرستی، انفرادیت پرستی اور خود پرستی کے دائرے سے نکل کر خدا پرستی کے تصوّر میں براہِ راست قرآن وسنّت سے اپنے موقف کی اصلاح کریں اور اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ ایمان وکفر میں مصالحت ممکن نہیں۔ حضور مفتیٔ اعظم علیہ الرحمہ ایک فتویٰ میں ارشاد فرماتے ہیں ''ایمان کو ایمان جیسا جاننا ضروری ہے یونہی کفر کو کفر جاننا، جو کفر کو کفر نہ جانے گا وہ ایمان کو ایمان کیا جانے گا کہ تعرف الا شیاء باضدادھا (چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں)

☆☆☆

میم کا پردہ

نعتیہ شاعری میں ''میم کا پردہ'' ایک ایسا خیال پارہ ہے جو ایک زمانے سے اربابِ فکر ونظر کے درمیان بحث کا موضوع بنا ہوا ہے اس کی ایک طویل داستان ہے۔اس موضوع کے تعلق سے بعض لوگ انتہائی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے نعت کا غیر مشروع موضوع تک قرار دے چکے ہیں۔ان کے خیال کے مطابق بعض شعرا ٔ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ اپنی جولانیٔ طبع اور شاعرانہ خیال آرائی وتخیل پروازی میں اور کبھی جذباتِ عقیدت کی رو میں ایسی نکتہ آفرینی یا یوں کہئے شگوفہ کاری کرتے ہیں کہ بات غلو تک پہنچ جاتی ہے یہ شرعی مزاج اور قانونِ شریعت کے نزدیک کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے جیسے ''احمد'' اور ''احد'' میں صرف میم کا پردہ ہے۔فی الحال چند اشعار بطورِ مثال ملاحظہ کریں۔

در احمد الف، نامِ ایزد بود ......زمیم آشکارہ محمد بود (غالب)

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر......وہ بزمِ یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر (اقبال)

تو احد ہے نام تیرا احمدِ بے میم ہے......زیب پایا تجھ صفت سے ہر ورق قرآن کا (سراج اورنگ آبادی)

احد سے صورتِ احمد میں اپنا جلوہ دکھلایا......بھلا پھر کس طرح سے کوئی اسکا مرتبہ جانے (نواب حیدر خاں حیدر)

معانی قل ھو اللہ احد کے ہیں یہاں ناسخ......برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمد کا (ناسخ)

سو جانیں میری احمدِ بے میم پہ قرباں......خلعت احدیت کا بھی پایا شب معراج (امیر مینائی)

کہاں اب جبہ سائی کیجئے کچھ بن نہیں پڑتا......احد کو کیجئے یا احمدِ بے میم کو سجدہ (محسن کاکوروی)

ذاتِ احمد تھی یا خدا تھا......سایہ کیا میم تک جدا تھا (''''''''')

عینیت غیرِ رب کو رب سے......غیریت عین کو عرب سے (''''''''')

ظاہر ہے کہ لفظِ احد واحمدِ بے میم......بے میم ہوئے عینِ خدا احمدِ مختار (امیر مینائی)

رسول اللہ کی صورت دیکھ کر سارے عرب بولے......ہمیں تو یہ عرب بے عین سا معلوم ہوتا ہے (نامعلوم)

مندرجہ بالا مثالوں میں کسی نہ کسی حد تک فکری موشگافیاں ہوئی ہیں۔ظاہر ہے اس طرح کی کاوشیں شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہیں ممکن ہے عوام میں یہ نکتہ سنجیاں غلط فہمیوں اور گمراہیوں کے ہزاروں دروازے کھول دیں۔اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ جن چیزوں سے شرعی طور پر قباحت لازم آتی ہو انھیں ادبی ذوق کی تسکین کے لئے برتنا مناسب نہیں۔

پیش کردہ مثالوں میں بعض اشعار کو تاویل کے ذریعے بچایا جاسکتا ہے جیسا کہ امام احمد رضا محدث بریلوی نے فتاویٰ رضویہ کی چھٹی جلد میں چند ایسے ہی اشعار کی تاویل فرماتے ہوئے احد اور احمد کے ضمن میں احد سرکار دو عالم ﷺ کے اسمائے مبارکہ میں ایک مقدس اسم بیان فرمایا ہے۔اس کے علاوہ بعض صوفیائے کرام کے یہاں اس مضمون کے اشعار نظر آتے ہیں۔جیسا کہ ڈاکٹر اسمٰعیل آزاد نے اپنی کتاب ''اردو شاعری میں نعت'' میں انہوں نے میم کے پردے کے تعلق سے کچھ مخصوص اشارے کئے ہیں موصوف مولوی عبدالحق کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔''راقم الحروف کے نزدیک دستیاب معلومات کی روشنی میں احد اور میمِ احمد کی بحث اردو نعت میں سب سے پہلے میراں جی کے یہاں ملتی ہے۔'' میراں جی کے سلسلے میں موصوف ہی رقم طراز ہیں۔'' میراں جی کی شخصیت وہ مہتم بالشان شخصیت ہے۔جس کو بانی اسلام نے خواب میں حرم شریف سے ہندوستان جانے کا حکم دیا اور جب انھوں نے معذرت کرتے ہوئے علاقائی زبان سے اپنی مکمل ناواقفیت کی بات عرض کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا'' مهمه زباں بشما خواهد "(بحوالہ اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیائے کرام کا کام '' بابائے اردو مولوی عبدالحق)

جہاں تک میرا مطالعہ رہنمائی کرتا ہے عربی نعتیہ شاعری میں اس خیال سے مملو اشعار دستیاب نہیں۔لیکن فارسی اور اردو کے قدیم سرمایۂ ادب میں ایک نہیں سینکڑوں مثالیں ضرور مل جائینگی گویا یہ ایک ایسا خیال پارہ ہے جو ایک عاشق رسول اور عرفائے کاملین سے ہوتا ہوا عام شعراء کی فکر ونظر کا محور بن گیا۔جسے ہم بجا طور پر اردو نعتیہ شاعری کا ''جذباتی مضمون'' سے تعبیر کرتے ہوئے عام لوگوں کو اس مضمون کے برتنے کے سلسلے میں محتاط ہونے کا مشورہ ضرور دینگے اور بزرگوں سے منسوب اشعار کی تاویل بھی کرینگے۔

جیسا کہ مولانا کوکب نورانی صاحب اس مسئلے کی بڑی حسین وضاحت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں،

''علاوہ ازیں ''انا احمد بلا میم'' کے بارے میں میرا موقف اب بھی یہی ہے کہ اس روایت سے اگر کوئی یہ ثابت کرتا ہے کہ نبی پاک ﷺ مخلوق نہیں تو مجھے کوئی بیان اس حوالے سے قبول نہیں۔ ہاں میم مظہریت کا ہو یا سرکارِ دو عالم ﷺ کو اللہ کی ذات وصفات کا آئینہ کہنے کی بات ہو تو دل و جان سے قبول ہے بلکہ ایمان ہے'' بحوالہ (نعت اور آدابِ نعت)

جن لوگوں نے نعتیہ شاعری میں اس موضوع کو غیر مشروع قرار دیا ہے ان کے یہاں بات بات میں شرک کے پہلو نکلتے ہیں حتیٰ کہ انہیں اپنے سوا سب کافر و مشرک ہی نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ انکے یہاں تعظیمِ رسول میں بھی شرک چھپا ہوا ہے ''معاذ اللہ'' جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے ناقدینِ ادب کو بھی محتاط ہونا از حد ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ نعتیہ شاعری صوفیائے کرام، علمائے کرام اور عاشقانِ خیر الانام کے نزدیک محض شاعری نہیں بلکہ عبادت بھی ہے۔ صوفیانہ شاعری اور عارفانہ کلام کے گہرے اثرات نعتیہ شاعری پر مرتسم ہوئے ہیں ایک عارف باللہ جذب وسلوک کی منزل عبور کرتے ہوئے کبھی فنا فی الشیخ، کبھی فنا فی الرسول اور کبھی فنا فی اللہ کی منزلوں سے گزرتا ہے۔ اب ایک عام انسان کیا سمجھے کہ ان کے لبوں پر جاری ہونے والا کلام کس مقام کا ہے۔ یوں بھی حالتِ جذب میں وارد ہونے والے کلام پر جلیل القدر علماً اور فقہاً سکوت سے کام لیتے ہیں۔ اور ممکن حد تک تاویل فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض کلام کو متشابہات پر محمول کرتے ہوئے انہیں بیجا اور ناروا تنقید سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر احتیاط رکھنی چاہئے کہ عام شعراً کی طرح مقتدر صوفی شعراٗ پر بے دریغ کوئی حکم نہ لگائیں۔ بلکہ خوب اچھی طرح شاعر کی شخصیت کی مختلف جہتوں اور کلام کی تہہ داریوں پر کمالِ احتیاط سے اپنی رائے کا اظہار کریں۔

☆☆☆

تشبیہات واستعارات

علمائے علمِ بیان کے نزدیک شاعری کی جان استعارہ ہے۔ جسکی عام فہم تعریف یہ ہے کہ حقیقت اور مجاز کے درمیان اگر لگاؤ تشبیہ کا ہے تو ایسے مجاز کو استعارہ کہتے ہیں۔ استعارہ میں مشبہ بہ (وہ شئے جس سے تشبیہ دیتے ہیں) کو عین مشبہ (وہ شئے جن کو تشبیہ دیتے ہیں) قرار دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی دونوں کے مناسبات وصفات کا ذکر بھی آتا ہے۔ استعارہ کا کمال یہ ہے کہ بے جا جذباتیت کی روک تھام کرتا ہے اور لفظوں کو جہانِ معنیٰ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ جب شاعر کے خیالات کے اظہار کے لئے موزوں اور مناسب الفاظ نہیں ملتے ہیں تو اسے الفاظ کے سینے کو چیر کر اس میں نئے معانی کی روح داخل کرنی پڑتی ہے۔ اور اس طرح استعارہ وجود میں آتا ہے جو شعر میں فکر کی دنیا آباد کر دیتا ہے۔ مثلاً

(۱) رہا جو قانعِ یک نانِ سوختہ دن بھر ...... ملی حضور سے کانِ گہر جزائے فلک (اعلیٰ حضرت)

(۲) مشک سا زلف شہہ ونور فشاں روئے حضور ...... اللہ اللہ جیب حبیب وتار دامن (اعلیٰ حضرت)

نعت میں جہاں استعارہ سے کام لیا جاتا ہے وہیں تشبیہات کے ذریعہ بھی کلام کی آرائش وزیبائش کی جاتی ہے۔ علمِ بیان میں تشبیہ کی تعریف یہ ہے کہ جب کسی چیز کو دوسری چیز سے باعتبار صفات مشابہ کرتے ہیں اور درمیان میں وجہ مماثلت موجود ہو تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ جس کو تشبیہ دیتے ہیں اسے مشبہ اور جس سے تشبیہ دیتے ہیں اسے مشبہ بہ کہتے ہیں۔ اور وہ صفت جو دونوں میں مشترک ہے اس کو وجہ شبہ کہتے ہیں اگر وجہ شبہ کو عیاں کردیں تو اسکو تشبیہ مفصل اور وجہ شبہ پوشیدہ رہے تو اسے تشبیہ مجمل کہتے ہیں۔ مثلاً

(۱) رنگ مژہ سے کرکے خجل یادِ شاہ میں ...... کھینچا ہے ہم نے کانٹوں پہ عطرِ جمالِ گل (اعلیٰ حضرت)

(۲) نعتِ حضور میں مترنم ہے عندلیب ...... شاخوں کے جھومنے سے عیاں وجد وحالِ گل (")

بعض شعراء اپنی نعتوں میں تشبیہات کے استعمال میں حد درجہ خطا کر گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) کب ہیں درخت حضرت والا کے سامنے ...... مجنوں کھڑے ہیں خیمۂ لیلیٰ کے سامنے (اطہر ہاپوڑی)

(۲) تجلی گاہ لیلائے دو عالم سرورِ عالم ...... (دل ایوبی)

پہلا شعر جس میں حضور سرورِ کائنات ﷺ کو لیلیٰ اور گنبدِ خضریٰ کو خیمۂ لیلیٰ سے تشبیہ دی گئی ہے جسے فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ نے ناپسند فرمایا اور شعر کی اصلاح یوں فرمائی۔

کب ہیں درخت حضرتِ والا کے سامنے..... قدسی کھڑے ہیں عرشِ معلیٰ کے سامنے

اب دیکھئے دوسری مثال کے مصرعے کی جانب ان مصرعوں میں وہی نقائص ہیں کہ حضور کو بصورتِ کنایہ لیلیٰ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس طرح بڑے مشاق شعراء کے یہاں بھی اس طرح کے نقائص نظر آتے ہیں دراصل تشبیہات واستعارات کے سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے ذرا سی لفظوں کی کج روی سے بھیانک چوک کا اندیشہ ہوتا ہے۔

دراصل غزل کی رومانیت سے چھن کر آنے والی تشبیہات جب نعت رسول میں پیش ہونگی تو ایسے اشعار سامنے آئینگے جہاں نعت اور رومانی غزل کا فرق معدوم ہوجائیگا اور نعت کا تقدس پامال ہوگا۔ مثلاً اختر شیرانی کا شعر دیکھئے ،

کس نے پھر چھیڑ دیا قصۂ لیلائے حجاز

دل کے پردے میں مچلتی ہے تمنائے حجاز

امام احمد رضا فاضل بریلوی نے اس ضمن میں ارشاد فرمایا کہ "وہ الفاظ جو معشوق مجازی کے لئے آتے ہیں جیسے۔ رعنا، دلربا نعت شریف میں ممنوع ہیں نہ تشبیہات تانیثی جیسے لیلیٰ کا استعمال ہو۔

(حیات اعلیٰ حضرت اول صفحہ ۳۵۰)

موجودہ جدید نعت کے مبصرین بھی غزل اور نعت میں فرق وامتیاز برتنے کا اشارہ کرتے رہے ہیں۔ ایک ناقد نے یہاں تک لکھا کہ "میں نے کبھی لکھا تھا کہ غزل باوضو ہوکر نعت بن جاتی ہے۔ مگر اب محسوس کرتا ہوں کہ غزل باوضو نہیں ہوسکتی جب تک شاعر خود باوضو نہ ہو۔ عارض ورخسار اور گیسو وکاکل کے تذکروں نے بھی نعت کو غزل بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حضور کے لئے معشوق، نازنین، طرحدار، خوبرو ایسے الفاظ نعت میں در آئے ہیں۔"

اس لئے مداحانِ رسول کو حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ☆

انتخاب الفاظ کا فقہی ضابطہ

علمائے کرام وفقہائے عظام نے نعت گوئی میں لفظوں کے انتخاب کے تعلق سے بہت کچھ لکھا ہے۔ جسے اگر ایک مداحِ رسول پیشِ نگاہ رکھے تو بے شمار شرعی وادبی نقائص سے محفوظ رہ سکتا ہے نعت نگاری خواہ نثر میں ہو یا نظم' میں الفاظ ہی اظہار و بیان کا وسیلہ بنتے ہیں جسے ماہرین ادب نے بھی تسلیم کیا ہے مثلاً ارسطو کا قول ہے کہ نثر ہو یا نظم الفاظ ہی سب کچھ ہوتے ہیں خیال الفاظ کا پابند ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ ''اشعار الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں اور خیالات الفاظ کے پابند ہوتے ہیں''۔ اسی طرح مغربی نقادوں نے الفاظ کے سلسلے میں اپنے نظریات مختلف انداز میں بیان کئے ہیں مثلاً ملارمے اور ڈیگا نے کہا ہے کہ ''شاعری خیالات سے نہیں بلکہ الفاظ سے ہوتی ہے'' اور وٹ جنس ٹائن نے کہا ہے کہ ''خیال الفاظ میں بند ہوتا ہے آپ جتنے لفظ جانتے ہیں اتنے ہی خیالات آپ کے پاس ہیں اور کارل کٹرس نے کہا ''گفتگو فکر کی ماں ہے الفاظ اسکی خادمہ ہیں'' وغیرہ۔

لفظ کی دنیا عجائبات اور طلسمات کی دنیا ہے اس کی صحیح قدر و قیمت اور شناخت کے لئے بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں۔

''الفاظ بھی ایک طرح سے جاندار ہیں وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، بڑھتے اور گھٹتے ہیں ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے وہ گذشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے وہ واقعی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے۔ یہ انشاء پردازی کا بڑا گر ہے۔''

مذکورہ ماہرین ادب کے نظریات وخیالات کو سامنے رکھ کر علمائے شریعت کے احکام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو انتہائی قیمتی درس نعت نگاروں کو مل جاتا ہے۔اس سلسلے کی ایک مکمل ہدایت ہمیں قرآن سے ملتی ہے۔جیسا کہ مشہور روایت ہے کہ یہودی جب دربارِ نبوی میں آتے تو اپنے سلام وکلام میں شعوری طور پر اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے کبھی ذو معنیٰ الفاظ بولتے تو کبھی چیخ کر کچھ کہہ دیتے اور کبھی زیرِ لب کچھ کہہ دیتے۔ظاہری آداب واطوار تو برقرار رکھتے مگر در پردہ شانِ رسالت ونبوّت کی توہین کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔انھیں جب حضور پُر نور ﷺ کی گفتگو کے دوران کچھ سمجھنے کی ضرورت پیش آتی تو لفظِ راعنا کا استعمال کرتے تھے۔اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجئے یا ہماری بات سن لیجئے مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے مثلاً عبرانی میں اس سے مشابہ ایک لفظ تھا جس کے معنیٰ تھے "سن تو بہرا ہو جائے" اور خود عربی میں اسکے ایک معنیٰ صاحبِ رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ ہماری سنو تو ہم تمہاری سنیں اور زبان کو ذرا لچکا دے کر "راعینا" بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنیٰ "اے ہمارے چرواہے" کے تھے۔لہٰذا قرآن نے اس لفظ کے استعمال ہی کو ممنوع ٹھہرا دیا اور اصحابِ رسول کو "اُنظُرنَا" کہنے کا حکم دیا گو کہ صحابہ کا مقصود وہ نہیں تھا مگر شانِ نبوت کے احترام کے پیشِ نظر انھیں بھی حکم فرمایا گیا۔ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ماہر رضویات حضرت ڈاکٹر مسعود احمد کراچی نے انتہائی اہم اصول وآداب پیش کئے ہیں۔مثلاً

(۱) ایسا لفظ جس کا معنیٰ اور اطلاق اگر چہ فی نفسہٖ صحیح ہو مگر اس سے تمسخر واستہزا ُ کا پہلو نکل سکتا ہو سرکارِ دو عالم ﷺ کے حضور استعمال کرنا ناجائز ہے۔

(۲) ایسے لفظ کا استعمال بھی جائز نہیں جو اگر چہ مقامِ ادب میں بولا جاتا ہو مگر اس سے ملتا جلتا لفظ مقامِ ادب سے گرا ہوا ہو۔

(۳) ایسے لفظ سے اگر چہ قائل کی مراد تمسخر واستہزا نہ ہو مگر پھر بھی وہ گنہگار اور قابلِ مواخذہ ہے۔

(۴) اس قسم کے الفاظ بھول چوک میں نکل جائیں تو اس کا تدارک لازم ہے۔

(۵) جان بوجھ کر کہے جائیں تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے اور حضرتِ سعد بن معاذ ﷺ کے نزدیک بلکہ خدا کے نزدیک بھی اسکا قائل واجب القتل ہے۔ (نورونار)

مندرجہ بالا نکات جو پیش کیے گیے ہیں ان میں بعض باتیں گرچہ فقہی اعتبار سے مجرد احتمال کے پیش نظر کہی گئی ہیں جو بہر صورت تعظیم رسول کے تحت ہیں۔ انسان دنیوی خسارہ کے تصور سے بڑی سے بڑی چیزوں سے بسا اوقات اجتناب کرتا ہے۔ یہاں تو عقبیٰ کا مسئلہ ہے۔ اہل ادب کے نزدیک مذکورہ خیالات ہمیشہ سے رائج رہے ہیں۔ اب رہ گئی بات مزید علمی اور فقہی معیار پر کھری اترنے کی تو اس سلسلے کی مزید گفتگو آگے آنے والی ہے

نعت گوئی میں لفظوں کا انتخاب ہمیشہ سے دشوار کن مسئلہ رہا ہے۔ پیش کردہ اشارات جس کا تعلق خالص زبان وادب کی روشنی میں اللہ ورسول کے تعلق سے لفظوں کے انتخاب کے سلسلے میں تھے اب دو مزید علمائے کرام کے خیالات جن کا تعلق فقہی وشرعی اصولوں سے ہے اور مندرجہ بالا ضابطے کا تعلق لاتقولوا راعنا والی آیت کریمہ اور تفسیر ابن عباس کی روشنی میں ہیں درج کر رہا ہوں۔

حضرت مولانا مفتی بدرالدین رضوی فرماتے ہیں۔

(۱) ''جس لفظ کے معنی متعدد ومختلف ہوں اور ان میں سے کوئی معنی قبیح یا حقیر ہو تو ایسے لفظ کا استعمال بارگاہ رسالت میں حرام ہے۔ ایسے الفاظ کے استعمال کرنے والوں پر توبہ واستغفار ضروری ہے۔

مظفر حسن ظفر ادیبی کے خیالات یوں ہیں۔

(۲) ''ایسے ذو معنی لفظ کی قطعی اجازت نہیں دی جاسکتی جس کے پردے میں کسی صیہونی مزاج رشدی خصلت کو اہانت رسول کا ادنیٰ موقع بھی مل سکے یا سامع کے ذہن میں کوئی قبیح مفہوم پیدا ہو سکے۔ اس بارگاہ عالی میں انتخاب الفاظ کا یہ صحیح معیار ہے۔''

یہ ضابطے نہایت سادہ عام فہم اور عوامی مزاج وشعور سے قریب تر ہیں لیکن محض یہ چند باتیں ہی زبان وبیان اور اسلوب وہیئت کے مسائل کہ جن کا تعلق خالص شعروادب سے ہے صحیح حل کے لئے کافی نہیں۔ ایسے بہت سے موقعے سامنے آتے ہیں جہاں علمائے فقہ نے اختلاف بھی فرمایا ہے۔ امام احمد رضا

نے احکام شریعت نامی کتاب میں ان ضابطوں کے تعلق سے بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے اور بہت سی مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت کی ہے۔

(۱) ''مجرد احتمال ہی موجب منع ہے'' قطعاً باطل ہے یوں تو ہزاروں الفاظ کہ تمام عالم میں دائرو سائر ہیں منع ہو جائینگے۔(فقہ شہنشاہ ص ۱۲)

(۲) مجرد احتمال اگر موجب منع ہو تو عالم میں کوئی کلام منع وطعن سے خالی نہ رہیگا۔(احکام شریعت ج ۱ ص ۵۷)

مزید فرماتے ہیں یہ قاعدہ واجب الحفظ ہے کہ آجکل بہت سے جہلا ایہام اور احتمال میں فرق نہ کر کے ورطۂ غلط میں پڑ جاتے ہیں۔''

اعلیٰ حضرت کے اقوال اور سلف صالحین کے فرمودات کی روشنی میں ایسے ضابطے کی ضرورت ہے جو علم صرف ونحو اور علم بلاغت کے ساتھ علم فقہ کے اصولوں سے مزین ہوتا کہ نعت گوئی کے لئے رہنما اصول کے طور پر استعمال کئے جائیں۔

حضرت مفتی مطیع الرحمٰن مضطرؔ نے اس سلسلے میں چند مفید ضابطے پیش کئے ہیں جنھیں یہاں تلخیص کے ساتھ نذر قارئین کرتا ہوں۔

(۱) یہ امر تو مسلم ہے کہ خدا اور رسول کی تعظیم ایمان و اسلام ہے اس لئے خدا اور رسول کے تعلق سے ایسے الفاظ کا استعمال جو معنیٰ تعظیم میں متعین ہوں سب سے اچھا ہے۔

(۲) اور ایسے الفاظ کا استعمال جو معنیٰ تعظیم میں ظاہر ہوں بہت اچھا ہے۔

(۳) اسی طرح ایسے الفاظ کا استعمال جو راجح التعظیم ہوں اچھا ہے۔

(۴) اس کے برخلاف خدا اور رسول کی توہین کفر و ہلاکت ہے اسی لئے خدا اور رسول کے تعلق سے ایسے الفاظ کا استعمال جو توہین کے معنیٰ میں متعین ہوں کفر یقینی، کلامی، اجماعی ہوگا۔

(۵) ایسے الفاظ کا استعمال جو توہین کے معنیٰ میں ظاہر ہوں متکلمین کے نزدیک قابل توقف ہوگا۔ فقہاء کے نزدیک کفر۔

(۶) ایسے الفاظ کا استعمال جن میں توہین کا ایہام ہو کفر تو نہیں البتہ ناجائز ہوگا۔

(۷) ایسے الفاظ کا استعمال جن میں توہین کا احتمال ایک گونا راجح ہو اچھا نہیں۔

(۸) جن الفاظ میں فی نفسہٖ توہین و تعظیم کسی جانب کوئی رجحان نہ ہو ضرورتاً ان الفاظ کے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ماہرین ادب نے لفظوں کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں۔ ہم یہاں فقہی اعتبار سے لفظوں کے اقسام کے تعلق سے چند گوشے مفتی مطیع الرحمٰن صاحب مضطرؔ کے تحریر کردہ پیش کرتے ہیں تاکہ معنوی اعتبار سے کوئی ناپسندیدہ صورت نعت گوئی میں پیدا نہ ہو۔

(۱) لفظ کے معنیٰ متعین ہوں، یعنی وہ لفظ معنیٔ موضوع لہٗ کے علاوہ دوسرے معنی میں نہ بولا جاتا ہو تو اس کو متعین المعنیٰ کہیں گے۔

(۲) لفظ کے معنیٰ متعین نہ ہوں یعنی وہ لفظ معنیٔ موضوع لہٗ کے علاوہ دوسرے معنیٰ میں بھی بولا جاتا ہو تو کوئی معنیٰ قریب الفہم ہو اور کوئی بعید الفہم اور معنیٰ بعید الفہم مراد ہونے پر کوئی قرینۂ خفیہ بھی نہیں۔ یا دونوں معنیٰ متساوی الفہم ہوں اور قرینۂ ظاہرہ سے کوئی معنیٰ راجح ہو تو اس کو ظاہر المعنیٰ کہتے ہیں۔

(۳) لفظ کا کوئی معنیٰ قریب الفہم ہو اور کوئی معنی بعید الفہم اور بعید الفہم معنیٰ کے مراد ہونے پر قرینۂ خفیہ ہو تو اس کو ایہام و توریہ کہتے ہیں۔

(۴) لفظ میں کئی معنوں کی صلاحیت ہو اور سب معانی متساوی الفہم ہوں لیکن کوئی معنیٰ عوام کے ذہن سے زیادہ قریب ہو تو "راجح الاحتمال" کہیں گے۔

(۵) لفظ کے سبھی معانی متساوی الفہم ہوں اور کسی معنیٰ کے رجحان پر کوئی قرینہ نہ ہو تو اسے محتمل التساوی کہیں گے۔ (تصغیر کی حقیت)

پیش کردہ ضابطوں میں چند اصطلاحات ایسے آگئے ہیں ہیں جن کے معنیٰ و مفہوم تک رسائی حاصل کرنا عام قاری کے لئے صبر آزما ہوگا اسلئے ان اصطلاحات کے معنی و مفہوم پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) معنیٰ تعظیم میں متعین ہونے کا مطلب ہے کہ لفظ کا جو معنیٰ ہے اس میں صرف تعظیم پائی جاتی ہے تعظیم کے خلاف معنیٰ نہیں پایا جائے

(۲) معنیٰ تعظیم میں ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تعظیم کے خلاف معنیٰ تو ہے لیکن اتنا خفی و پوشیدہ کہ ذہن اس طرف جاتے ہی نہیں۔

(۳) راجح التعظیم:۔لفظ کا استعمال تعظیم کے معنیٰ میں غالب ہو

(۴) محتمل التساوی:۔دونوں احتمال برابر درجے کے ہوں۔

(۵) متساوی الفہم:۔یعنی دونوں معنیٰ یکساں طور پر سمجھ میں آتے ہوں۔ (۶)

مجرد احتمال:۔محض امکان کے سہارے کسی لفظ میں بغیر قرینہ اور دلیل کے معنیٰ پیدا کرنا۔

مذکورہ جو ضابطے بیان کیے گئے ہیں ان کا تعلق فتویٰ نویسی سے ہے جہاں قرآن وحدیث اور اصولِ فقہ کی روشنی میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے یہ کام ادباً شعراً کا نہیں حتی کہ ایسے علماً جنہیں اصولِ فقہ پر دسترس نہیں انہیں بھی فتویٰ دینے کا اختیار نہیں یہ منصب بڑا عظیم ہے۔ناقلِ فتویٰ ہونا اور ہے اور صاحبِ تفقہ کی منزل اور ہے اس لئے ناقدینِ شعروادب کو بھی حد درجہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

صنعتِ تلمیح کا استعمال

اکثر شعرائے نعت کا یہ طریقہ رہا ہے کہ مدحتِ رسالت میں قرآنی آیات کے حصوں کو پیش کرتے ہیں۔ علمائے بلاغت نے صنعتِ تلمیح کی تعریف میں یہ بیان کیا کہ اس صنعت میں شاعر کسی مشہور مسئلہ یا قصہ یا مثل یا کسی علمی اصطلاح کا یا پھر قرآنِ مجید اور احادیثِ کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم ...... علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

شعر کے پہلے مصرعے میں ایسی تین چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر قرآنِ مجید میں حضرتِ خضر اور حضرتِ موسیٰ علیہما السلام کے ہمسفر ہونے کے واقعے میں ہے۔ نعتیہ شاعری میں قرآنی آیات کا مفہوم یا حدیث کے صاف حوالے حتیٰ کہ معجزات کا بیان بھی صنعتِ تلمیح کے ذیل میں آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک طرز اقتباس کے متعلق ہے مختصر المعانی میں ہے کہ کلام میں قرآن یا حدیث کا کوئی ایسا ٹکڑا بیان کیا جائے جس کو بعینہٖ قرآن کی آیت یا حدیث نہ کہا جائے۔

قرآن کی آیات اور احادیث کے ٹکڑوں کو نظم کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ شاعر کہیں تحریفِ معنوی کا شکار نہ ہو جائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہیں لفظوں کا ترجمہ ہی بدل جاتا ہے اور مفہوم کچھ سے کچھ نکلتا ہے۔ جو ترجمہ اور اصولِ تفسیر کے منافی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اگر قرآن و حدیث کے ٹکڑوں کو نظم کریں تو شعوری طور پر مصرعوں میں یہ اہتمام ہونا از حد ضروری ہے کہ شعر کا کلیدی جز آیات و احادیث کا اشاریہ ہو۔ بعض لوگ قرآنی آیات و احادیث کو بے محل فقط مصرعوں کو باوزن بنانے کے لئے موزوں کر دیتے ہیں شعر کچھ ہوتا ہے اور مفہوم کچھ نکلتا ہے جس سے شعر کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ قرآنی آیات میں متشابہات اور محکمات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے حدیث کے باب میں ضعیف احادیث فضائل میں اگرچہ پیش کئے جاتے ہیں مگر حدیث کے نام پر عربی مقولوں کو پیش کرنا جہالت و ضلالت کے سوا کچھ بھی نہیں اس لئے مستند احادیث کو نظم کرنا بہتر ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی کے ان اشعار کو ملاحظہ کریں کہ قرآن وحدیث اور اخبار وآثار کے انوار وتجلیات سے کس طرح ان کی شاعری کا گوشہ گوشہ روشن ومنور رہے۔

وَلَسوفَ یُعطِیکَ رَبُّکَ فَترضیٰ..... حق نمودت چہ پا سدار یہا

وَرَفعنا لَکَ ذِکرکَ کا ہے سایہ تجھ پر..... بول بالا ہے ترا ذکر ہے اونچا تیرا

غنچے ما اَوحیٰ کے جو چٹکے دَنیٰ کے باغ میں..... بلبلِ سدرہ تک ان کی بو سے بھی محرم نہیں

لَیلتہ القَدر میں مَطلَعِ الفَجر حق..... مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام

معنئ قَد رَایٰ مقصدِ مَا طَغیٰ..... نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام

قرآنی تلمیحات کے استعمال کے بعد احادیثِ کریمہ کی تلمیحات کے حسین جلوے ملاحظہ کریں،

مَن زَارَ تُربَتِی وَجَبَت لہُ شَفَاعَتِی..... ان پر درود جن سے نویدان بشر کی ہے

اسے سخنوری کی معراج کہیے کہ امام الکلام نے اپنے کلام میں بیک وقت تلمیحِ قرآن وحدیث کو اپنے اشعار میں کمالِ احتیاط سے پیش فرمایا

ان پر کتاب اتری بَیَاناً لِکُلِّ شَیٍٔ..... تفصیل جس میں مَاعَبر ومَاغبر کی ہے

نہ عرش ایمن نہ اِنِّی ذَاھِب میں میہمانی ہے..... نہ لطف اُدنُ یَا اَحمَد نصیبِ لَن تَرَانِی ہے

اس طرح کی بہت ساری مثالیں مذکورہ باتوں کی روشنی میں پیش کی جاسکتی ہیں میں نے صرف شعرائے نعت کی رہنمائی کے لئے چند مثالیں پیش کردی ہیں تاکہ شعرائے کرام ان باتوں کو اپنی نگاہ میں رکھیں۔ورنہ رشید وارثی جیسے فنکار کو نعت رنگ کے کسی شمارے میں دوبارہ ''اردو نعت میں صنعتِ تلمیح کا غیر محتاط استعمال'' لکھنے کی زحمت ہوگی۔

ادبا اور شعرا تو مبالغہ آرائی اور غلو پسندی کے سبب غیر محتاط ہو جاتے ہیں تو حیرت کی بات نہیں کیوں کہ ادب کی دنیا فکر وخیال کی دنیا ہے۔شاید اسی سبب سے ڈاکٹر محمد اسحٰق نے نعت رنگ کے ایک شمارے میں اپنا نظریہ یوں پیش کیا ہے

'' صبرِ ایوب، گریۂ یعقوب یا طوفانِ نوح اب تلمیح کے طور پر مستعمل ہیں اسلئے اگر کوئی صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا، تو وہ اپنی کیفیات کو تاریخی تناظر میں بیان کررہا ہے۔ہمسری کا دعویٰ پیش

نہیں کررہا ہے۔ یقیناً زبان کی ثروت ایسے ہی کلمات اور ایسی ہی تراکیب سے ہے (ص ۱۸۴) انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں اپنے اس بیان کی تائید میں وہ فرماتے ہیں،

''دلِ بے دارِ فاروقی، دلِ بے دارِ کرّاری، جسارت نہیں کسبِ فیض کی اک تمنا ہے۔
اس بیان کے پیشِ نظر مولانا کوکب نورانی نے اپنے مکتوبات (نعت اور آدابِ نعت) میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور صبرِ ایوب، گریۂ یعقوب، طوفانِ نوح، حسنِ یوسف، لحنِ داؤد، دمِ عیسیٰ، عصائے موسیٰ (علیہم السلام) کا بیان کسی غیرِ نبی کے لئے تلمیح کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بھی جس قرینے اور سلیقے کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کا حصّہ نہیں اس لئے انکا (عام استعمال) زبان کی ثروت ظاہر کرنے اور معروف مفہوم کی ادائیگی کے لئے جائز نہ جانیں، زبان اور مفہوم سے کہیں زیادہ اہم وہ معتقدات اور مراتب ہیں جنکی پاسبانی ہمارا امتیاز ہے انکے بیان میں ہم ایسی آزادی کیسے گوارہ کرسکتے ہیں جو ہمارے ایمان کے لئے مسئلہ ہو''

مقامِ حیرت ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے مولانا نے بڑی خوبصورت شرعی تنبیہ فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ ایک چونکا دینے والا اقتباس بھی پیش فرمایا ہے۔ مولانا کوکب نورانی ڈاکٹر الحق کو مخاطب کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں،

''ڈاکٹر صاحب نے نعت رنگ (۱۳) میں میری تحریر میں ''فتاوٰئے رشیدیہ کے حوالے سے یہ جملہ ملاحظہ کیا ہوگا'' لفظِ رحمت اللعالمین صفتِ خاصّۂ رسول ﷺ نہیں معاذ اللہ۔ اسی تحریر میں افاضاتِ یومیہ کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی نسبت گنگوہی صاحب باربار ''رحمت اللعالمین'' فرماتے رہے، کتاب ''ارواحِ ثلاثہ'' (مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی) کے ص ۲۷۰، ۲۷۱ پر ہے.... ''راستے میں جو کچھ بھی ملتا وہ سب (نانوتوی صاحب) ان لوگوں کو دے دیتے اور ساتھیوں نے کہا کہ حضرت آپ تو سب ہی دے دیتے ہیں کچھ تو اپنے پاس رکھئے تو (محمد قاسم نانوتوی نے) فرمایا ''انما انا قاسم و اللہ یعطی ''.......''

یہ ہے غیرِ نبی کو صفاتِ رسول سے متصف کرنے کا انجام کہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس لئے نعت گو شعرا کو تلمیحات کے استعمال میں حد درجہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ ☆☆

تعظیمی ضمائر

نعت گوئی میں ضمائرِ مخاطب کے استعمال پر ان دنوں ہند و پاک کے اربابِ نقد و نظر میں ایک بحث چھڑی ہوئی ہے۔ گو کہ یہ مسئلہ آج کا نہیں بلکہ کئی دہائیوں کا ہے اس کے باوجود اس مسئلے کا حل اطمینان بخش نہ نکل سکا۔ بات دارالافتا تک پہنچ گئی جہاں اضطرابِ شوق کو تسکین دینے کے لئے علمائے فقہ نے بڑی حد تک گنجائش پیدا کر دی مگر یہ ادب کی دنیا بھی کیا دنیا ہے جہاں خاکستر میں چنگاریاں تلاش کی جاتی ہیں۔ ذرا غالبؔ سے پوچھئے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا..... کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

موجودہ دور میں نعت رنگ میں شائع ہونے والے مباحث کا ایک خاکہ ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا کوکب نورانی صاحب اپنے مجموعۂ مکتوبات بنام "نعت اور آدابِ نعت" میں یوں رقم طراز ہیں۔

"بلاشبہ کوئی مومن نہیں چاہے گا کہ اس سے کوئی ایسا لفظ سرزد ہو، جو بارگاہِ رسالت کے آداب اور ذاتِ رسالت ﷺ کی تعظیم و توقیر کے منافی ہو۔ وہ متقدمین جو عشقِ مصطفوی کی روشن تصویر تھے، کیا وہ اس بات کی اہمیت اور اس راہ کی کٹھنائیوں سے آگاہ نہیں تھے؟ ایک عام شخص پوچھتا ہے کہ تخاطب میں یہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بلا خوف اور بلا جھجک کہے جا رہے ہیں کیا بارگاہِ ایزدی کے لئے روا ہیں؟ کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ تو قرب اور پیار ظاہر کرتے ہیں ان میں توہین و تحقیر کا شائبہ بھی نہیں کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ صرف اردو ہی کا مسئلہ ہے کسی اور زبان کا کیوں نہیں؟ ان زبانوں میں جو لفظ تخاطب کا ہے وہ سب کے لئے ایک ہی ہے کوئی کہتا ہے کہ صرف تخاطب ہی نہیں، بیان میں بھی یہ مسئلہ ہے، صیغہ واحد کو وہ ادب و تعظیم کے خلاف بتایا ہے کوئی کہتا ہے کہ اہلِ ایمان میں عربی کے سوا کوئی زبان مروّج ہی نہیں ہونی چاہئے تاکہ ایسی مشکلات کا تصوّر ہی نہ رہے"

اس بیان سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اضطراب کس قدر بڑھ چکا ہے سوالوں کا ایک دفتر

ہے انہیں مشکلات کے پیشِ نظر مولانا موصوف اس لسانی مسئلے کا حل نکالنے کے لئے اہلِ زبان کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے عرض گزار ہیں۔

''پروفیسر محمد اکرم رضا صاحب اور وہ تمام لوگ جو ''تو، تیرا، تجھ'' کے الفاظ کا استعمال ناممکن بتا رہے ہیں وہ اس کا حل بھی بتائیں اور صیغہ واحد کے حوالے سے اور بیانیے میں دیگر مشکلات کا جواب بھی دیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ''راعنا'' کہنے سے منع کیا تو ''انظرنا'' کا لفظ بیان کر کے حل بھی بتا دیا ہے۔''

تعجب ہے، ہم ایک ایسے مسئلے میں الجھ پڑے جنکا حل نکالنا خود ہمارے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ دراصل ہم نے اپنے اکابر علماً، فقہاً، صلحاً اور لاکھوں مدّاحانِ رسالت پر اعتماد نہیں کیا اور خود کو ان سے زیادہ محتاط اور حسّاس کہلانے کی فکر میں خود ہی الجھتے چلے گئے۔ اس کا بہتر راستہ تو یہی ہے کہ اپنے بزرگوں پر اور ان کے عشقِ رسالت پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے انہیں کی روش کو اختیار کرلیں۔ اس سلسلے کی مزید باتیں آئندہ سطروں میں بیان ہوں گی یہاں عام طلباً اور مدّاحانِ رسول کی رہنمائی کے لئے آموختہ کے طور پر ابتدائی گفتگو سے اس سلسلے کو آگے بڑھاتا ہوں۔

زبان وادب اور قواعد ولغت پر نگاہ رکھنے والوں کے لئے ضمیر کا مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے۔ ضمیر کی اصل وضع اور محلِ استعمال قواعد کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ دراصل ضمیر وہ لفظ ہے جو اسم کی جگہ آئے یعنی اسم کو بار بار استعمال نہ کر کے اس کی جگہ جو لفظ آئے اسے ضمیر کہتے ہیں۔

دنیا کی ہر زبان میں ضمیر کے الفاظ ہیں۔ اردو دانوں نے ضمیر کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں مثلاً...... ضمیر شخصی، ضمیر اشارہ، ضمیر استفہامیہ، ضمیر موصولہ، ضمیر مخاطب، ضمیر واحد، ضمیر حاضر، ضمیر غائب ضمیر فاعلی، ضمیر مفعولی اور اضافی وغیرہ ضمیر کی خصوصیات کا علم قواعد کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے

مجھے یہاں ضمیر کی تفصیلات سے بحث نہیں کرنی ہے بلکہ ضمیر کے جو الفاظ متعین ہیں ان میں لفظ ''تو'' سے متعلق اربابِ ادب اور علمائے فقہ کے خیالات کو مختصر طور پر پیش کرنا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ بعض اربابِ خلوص اس سلسلے میں معترض رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتحپوری لکھتے ہیں۔

"آداب نعت میں یہ بھی داخل ہے کہ حضور ﷺ کو جس صفت یا جن ضمائر سے تخاطب کیا جائے وہ احترام واکرام اور ادب کو اپنے معنیٰ میں سموئے ہوئے ہوں۔ عربی اور اسی طرح فارسی میں ضمائر کے امتیازات نہیں ہیں لیکن اردو میں کچھ ضمیریں معظم ومکرم شخصیتوں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں جو اپنے مراجع کی علو ثانی اور رفعت مکانی کو ظاہر کرتی ہیں۔ نعت میں اسی قبیل کے ضمائر اور الفاظ استعمال کیے جانے چاہییں۔ سب سے پہلے جنگ بہادر خاں تابش نے اپنے نعتیہ مجموعۂ کلام "نسیم طیبہ" میں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ضمائر کا استعمال توجہ طلب ہے۔ اردو زبان میں بہت سے کلمات تعظیم کے لئے مستعمل ہیں۔ اسی لئے ضمائر "تو" اور "تم" ضمائر کا استعمال ذوقِ صحیح پر جو شریعت کا بھی رہین منت ہے کسی قدر گراں گزرتا ہے۔ اگر چاہیں تو اس کی جگہ ضمیر غائب کے الفاظ یعنی "وہ" اور "ان" مستعمل ہو سکتے ہیں واحد حاضر کے لئے کم از کم آپ کا لفظ آ سکتا ہے۔"

(نعتیہ شاعری کا ارتقا صفحہ ۷۳)

اگر ان اعتراضات کے پیش نظر قدیم وجدید شعری سرمائے کا جائزہ لیں تو شاید ہی کوئی اس زد سے محفوظ رہ پائیگا۔ لہٰذا اسی طرح کے اعتراضات کے پیش نظر علمائے کرام اور فقہائے عظام نے احکامات جاری فرمائے۔ مثلاً علامہ مظفر حسن ظفر ادیبی تحریر فرماتے ہیں۔

"تو، تیرا کا استعمال زمانۂ قدیم سے اردو زبان کے لغت گو شعراء کرتے آئے ہیں اس پر کبھی کسی عالم نے اعتراض نہیں کیا اور نہ سامعین نے اس میں کوئی قباحت محسوس کی۔ ہماری زبان میں خطاب کے لئے تین الفاظ ہیں۔ برتر کے لئے آپ، کم درجہ کے لئے تم، کمتر کے لئے تو۔ اور انھیں کے لحاظ سے آپ کا تمہارا اور تیرا الفاظ لائے جاتے ہیں۔ وضع لغت یونہی ہے لیکن اہل زبان اپنے محاورہ میں تو تیرا کا استعمال کبھی پیار محبت اور اظہار بے تکلفی کے لئے کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسن طباطبائی کا شعر دیکھئے۔

پیار جب حد سے بڑھا سارے تکلف مٹ گئے
آپ سے وہ تم ہوئے پھر تو کا عنواں ہو گئے

اور سچ پوچھیے تو بعض مقامات پر لفظ "تو" میں جو خودسپردگی کی کیفیت پنہاں ہوتی ہے وہ

نہ آپ میں محسوس کی جاسکتی ہے نہ لفظ تم میں۔اس لئے نعت پاک میں ان کا استعمال قطعاً درست ہے اس میں شرعی یا ادبی کوئی قباحت نہیں۔ (لفظ کملی کا استعمال اور ادبی جائزہ)

اس طویل اقتباس میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں ان سے قدرے تشفی ہو جاتی ہے۔فقیہ عصر مفتی مطیع الرحمٰن صاحب مضطرؔ اپنا جواب تحریر فرماتے ہیں۔

''اگر لفظ تو کی وضع واحد کمتر کے لئے ،لفظ ''تم'' کی وضع واحد کم درجے کے لئے اور لفظ آپ کی وضع واحد برتر کے لئے ہوتی تو عربی میں لفظ ''انت'' کا ترجمہ تو، تم، آپ تینوں ہی کیا جانا چاہیے۔علاوہ ازیں لفظ تم کی وضع تو لفظ ''تو'' کی جمع کے طور پر ہے۔البتہ جس طرح عربی وفارسی میں صیغۂ جمع کا اطلاق تعظیماً واحد کے لئے بھی کر دیتے ہیں اسی طرح اردو میں مخاطب واحد کے لئے تعظیماً لفظ ''تم'' کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔فیروز اللغات جدید میں ہے ''تم'' ہندی ''تو'' کی جمع تعظیماً واحد کو بھی کہتے ہیں۔اس لئے لفظ تو وضعاً محتمل التساوی ہوا۔ہاں غیر خدا کے لئے کلام منثور میں مستعمل ہے تو جب تک کوئی واضح قرینہ نہ ہو عرفاً تحقیر متبادر ہو گا مگر کلام منظوم میں ایسا نہیں۔''

اس اقتباس سے شرعی حکم واضح ہوا کہ نعت میں مذکورہ ضمائر کا استعمال درست ہے۔اس میں کوئی قباحت نہیں۔عام طور پر صاحبان ذوق اپنے زاویہ نظر سے کسی شئے کو مستحسن اور کبھی ذوق لطیف کے تحت کسی چیز کو رد کر دیا کرتے ہیں۔انھیں اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کی تائید میں مضبوط اور مستحکم دلائل لانے چاہئیں بے محابا بزرگوں پر اعتراض کوئی اچھی بات نہیں۔کیونکہ قواعد اور لغات ہی میں تو کے غیر تعظیمی نہ ہونے کی صریح وضاحت ملتی ہے مثلاً۔قواعد اردو میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔''نظم میں اکثر مخاطب کے لئے (تو) لکھتے ہیں۔یہاں تک کہ بڑے لوگوں اور بادشاہوں کو بھی اسی طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔''

یہی سبب ہے کہ علمائے شریعت نے بہت سی نزاکتوں کے پیش نظر ہمیشہ ایک اصول اپنے پیش نگاہ رکھ کر اس طرح کے لسانیاتی اختلاف کا فیصلہ فرمایا ہے علماء فرماتے ہیں ''نظم پر نثر کا قیاس بھی ضعیف ہے کیونکہ کلام منظوم میں بہت سی وہ باتیں روا ہیں جو کلام منثور میں روا نہیں'' دراصل شاعری میں نثر کی طرح آزادی اور قطعیت تو ممکن نہیں۔شاعری کوزے میں

سمندر سمونے کا فن ہے۔ جس طرح صرف ونحو کی روشنی میں نثر کے آداب مختلف ہیں اسی طرح شاعری میں عروض وبحور اور شعری زبان کی کیفیت مختلف ہوا کرتی ہیں۔ یہاں علم بیان اور علم معانی کی منظر نگاری کچھ اور ہوا کرتی ہے اس بحث سے متعلق ممتاز اردو دانشور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

''تو کا لفظ ربّ العزت کے لئے ہماری زبان میں بنیادی طور پر استعمال ہوا ہے پھر یہ لفظ صرف اللہ اور رسول کی نسبت سے ہماری زبان کا سب سے زیادہ محترم لفظ ہے۔ عشقیہ شاعری میں بھی یہ اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے خاصان محمد ﷺ نے اپنے رسول، اپنے آرام جاں اور اپنے محبوب کے لئے مسلسل یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظوں کے معنی محض لغت یا اپنے وہم اور مذاق میں تلاش نہ کیجئے زندگی اور زبان کے عام اور زندہ استعمال میں تلاش کیجئے۔'' (بحوالہ نعت رنگ)

حضرت مفتی مطیع الرحمٰن کا حکم شرع بھی ملاحظہ فرمالیں تاکہ ادبی وشرعی دونوں حیثیتوں سے بات مکمل ہوجائے۔ ''اس لئے نعت پاک میں اس لفظ کے استعمال کو ممنوع نہیں کہا جا سکتا جب لفظ تو کے اطلاق کا حکم معلوم ہوگیا تو لفظ تیرا کے حکم کا اطلاق بھی واضح ہے کیونکہ تیرا لفظ تو ہی کی اضافی صورت ہے۔ بحوالہ (تصغیر کی حقیقت)

شعری زبان میں اہلِ عقیدت نے جو برائے تعظیم ضمائر کا استعمال کیا ہے اور اپنے محبوب کو واحد ضمائرِ مخاطب ''تو، تیرا، تجھ'' کے الفاظ سے یاد رکھنے کی روش قائم فرمائی ہے اگر بغور دیکھا جائے تو ان کی مومنانہ فراست ہمارے بہت سارے الجھے ہوئے سوالوں کا روشن جواب ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری نے جو لکھا ہے کہ

"اگر چاہیں تو اس کی جگہ ضمیرِ غائب کے الفاظ یعنی ''وہ'' اور ''ان'' مستعمل ہو سکتے ہیں اور واحد حاضر کے لئے کم از کم ''آپ'' کا لفظ آسکتا ہے"

بیانیہ کے لحاظ سے مجھے ''وہ'' اور ''ان'' کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں چاہے ضمیر کچھ بھی ہو لیکن اگر کسی انسان کا ضمیر ہی غائب ہو جائے اور وہ عقیدۂ حاضر وناظر فراموش کرتے ہوئے رسول رحمت کو ضمیرِ غائب سے مخاطب کرنے میں عافیت محسوس کرے اور دوسروں سے بھی تقاضہ کرے تو

ایسے سارے مطالبات اہلِ سنّت و جماعت کے نزدیک کارِ عبث ہیں ۔ایک مخصوص طبقے کا بار بار اصرار شاید اسی سبب سے ہے کہ وہ رسولِ مکرم ﷺ کو ایک عام بشر سمجھتے ہوئے حیات النبی کا انکار کرتے ہیں ۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ عربی میں ''انت'' فارسی میں '' تو، ترا، شما "اور انگریزی میں ''You'' اور اردو میں ''آپ'' کا لفظ بطورِ تعظیم استعمال ہوتا ہے مگر یہ انکشاف جو حضرت مولانا کوکب نورانی صاحب نے فرمایا کہ

''آپ'' کا لفظ صرف اردو داں طبقے میں مستعمل ہے حالانکہ افریکانز اور ڈچ زبان میں یہی لفظ ''آپ'' ایک جانور کے لئے ہے''

ہم اردو داں طبقہ ''آپ'' کا استعمال ہر صاحبِ تعظیم کے لئے کرتے چلے آئے ہیں اور ہم اپنی ہی زبان کے پابند ہیں حتٰی کہ نعتِ رسول میں بھی پیش کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہوتی " آپ" کی یہ اطلاع بعض ذہنوں میں انتشار پیدا کرسکتی ہے کہ پہلے "تو، تیرا، تجھ" پر بحث کا دروازہ کھلا اور ''آپ'' پر دروازہ ٹوٹ گیا۔میں آپ کا منشأ خوب جانتا ہوں کہ آپ یہ بات، ہم اہلِ سنّت وجماعت کے لئے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ آپ کا اشارہ ان کی طرف ہے جو ضمیرِ غائب پر اصرار کر کے اپنے باطل عقیدے کو تسکین دینا چاہتے ہیں اور عام لوگوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

تعظیمی ضمائر کے استعمال کا اصل منشاء یہی ہے کہ اسم ذات کی تکرار سے بچا جائے اور جو الفاظ ضمائر کے لئے وضع کئے گئے ہوں انھیں استعمال کیا جائے میرے خیال میں اگر ضمائر کے الفاظ میں رسول کریم ﷺ کے اسمائے صفات اور القابات وخطابات شامل کر لئے جائیں تو حسن شعر میں اضافہ کے ساتھ مختلف معنوی جہتیں بھی روشن ہو جائینگی۔

علامہ اجل امام جلال الدین سیوطی نے اسمائے نبوی کی تعداد ایک سو کے قریب بیان فرمایا ہے اور امام احمد رضا محدث بریلوی نے تین سو کے قریب فرمایا ہے لہٰذا مداحان رسالت کو ان اسمائے مقدسہ کو یاد کرنا چاہئے اور انہیں ضمائر کی جگہ پیش کر کے جہان شعر وادب میں مزید معنویت کے امکان کو روشن کرنا چاہئے۔

☆☆☆

کلماتِ تصغیر

ہندوستان کے اکثر اردو نعت گو شعراء جو جلسۂ میلاد النبی ﷺ اور نعتیہ مشاعروں میں زمزمہ سنجی کرتے ہیں ان کے ذہن وفکر میں یہ مسئلہ نہیں تھا کہ کلماتِ تصغیر کیا ہیں اور ان کے شرعی احکامات کیا ہیں ۔مگر جب یہ مسئلہ ہندوستان کے چند ممتاز علماء کے درمیان لفظِ (کملی) کے مصغّر ومکبّر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق موضوعِ بحث بنا تو اب ہر محفل میں پوچھا جانے لگا کہ کلماتِ تصغیر کیا ہیں اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے ۔میری معلومات کے مطابق اس موضوع پر کم سے کم چھ(۶) کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن کے مطالعے سے بہت سے علمی گوشے روشن ہوتے ہیں مثلاً

(۱) نورانی مقالہ، حضرت مولانا مفتی بدرالدین (۲) لفظِ کملی کا ادبی وشرعی جائزہ، ظفر ادیبی مبارکپوری (۳) لفظِ کملی پر مولانا اختر رضا خاں کے شبہات کا ازالہ، حضرت مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی الجیلانی (۴) تنقیحِ مطالب، حضرت مولانا مفتی معراج احمد مصباحی (۵) تصغیر کی حقیقت، حضرت مولانا مفتی مطیع الرحمن رضوی (۶) شانِ رسالت اور تصغیر، حضرت مولانا صدرالوریٰ قادری، ان کتابوں کے بعد مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں مگر ہمارے نومشق شعرائے کرام اور طلبائے کرام کی ذہنی وفکری اور علمی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے عوامی لحاظ سے کچھ ضروری باتیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ وہ نعت شریف لکھتے وقت ان باتوں کا لحاظ رکھیں اور اپنے کلام کو شرعی ولسانی غلطیوں سے ممکن حد تک بچانے کی کوشش کریں ۔ مجھے اس ضمن میں علمائے کرام کے علمی شہہ پاروں سے استفادہ کرتے ہوئے انکا احترام بھی بجالانا ہے اور طلباء کی ضرورت کی تکمیل بھی کرنی ہے ۔میری گفتگو اردو زبان وادب کے دائرے میں رہے گی اگر خدانخواستہ کسی لسانی پہلو سے فکر ونظر کا کوئی دوسرا پہلو نکل پڑے تو اسے میرے ذاتی خیالات پر محمول کیا جائے ۔

ماہرین لسانیات نے اردو قواعد کی کتاب میں ''اقسامِ اسمِ ذات'' کے تحت اسم ظرف، اسم آلہ، اسم تصغیر، اسم مکبر اور حاصل مصدر بیان کئے ہیں جسے ابتدائی درجے کے نصاب میں تفصیلی طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

نعت گوئی میں صیغۂ تصغیر سے متعلق بچنے کی ہدایت عام طور پر علمائے دین اور فقہائے شرع میتن نے فرمائی ہے۔ مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں ہے

''نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک کو تصغیر کے صیغہ سے تعبیر کرنا بعض کے نزدیک کفر ہے اور بعض کے نزدیک کفر نہیں۔ ہاں بطریق توہین ہو تو سب کے نزدیک کفر ہے۔'' (ج ۲۔ص ۲۸۲)

اسم تصغیر سے متعلق آسان اور عام فہم تفہیم کی ضرورت ہے اس لئے پہلے اردو قواعد کی روشنی میں معلومات حاصل کئے جائیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

تصغیر کے معنی چھوٹا کرنے کے ہیں۔ بعض اوقات الفاظ میں کسی قدر تغیر کر کے یا بعض حروف کے اضافے سے اسماء تصغیر بنا لیتے ہیں۔

(۱) کبھی تصغیر محبت کے لئے بنائی جاتی ہے۔ مثلاً بھائی سے بھیا، بہن سے بہنا۔

(۲) کبھی حقارت کے لئے جیسے مرد سے مردوا، جورو سے جروا۔

(۳) کبھی چھوٹائی کے لئے جیسے شیشہ سے شیشی یا شیشیا۔

اردو میں اسماء تصغیر کئی طرح سے آتے ہیں۔

(۱) الفاظ کے آخر میں (ا) (وا) بڑھا دینے سے جیسے جورو سے جروا، مرد سے مردوا، بھائی سے بھیا وغیرہ۔ بعض اوقات مختلف علامات ڑا، ڑے، لی، لا، یا وغیرہ بڑھا کر اور الفاظ میں کسی قدر تبدیلی کر کے جیسے آنکھ سے انکھڑی، گٹھے سے گٹھری، مکھ سے مکھڑا وغیرہ۔

بعض اوقات محض حقارت کے لئے جیسے روپیہ سے روپلی بولتے ہیں۔ سودا نے ایک جگہ شاعر کو حقارت سے شاعرلا لکھا ہے۔ بعض اوقات اسم خاص کی تصغیر (تحقیر کے لئے) بنا لیتے ہیں۔ جیسے لکھنوی سے لکھنوا، کانپوری سے کانپوریا وغیرہ۔ ''اردو قواعد''

(۲) مغربی بنگال کے ممتاز شاعر و ادیب جناب اختر جاوید اپنی کتاب ''ایشیا اردو قواعد مع مضامین'' میں لکھتے ہیں۔

''جس اسم میں چھوٹائی پائی جائے اسے اسم صغیر کہتے ہیں۔ لفظ کے آخر میں۔ ی۔ لا۔ ڑا ڑی۔ ط۔ ا۔ چی۔ نا۔ ک۔ لگاتے ہیں جیسے۔

پہاڑ سے پہاڑی۔ دیگ سے دیگچی۔ عین سے عینک۔ آنکھ سے انکھڑی۔ پنکھ سے پنکھڑی۔ ڈھول سے ڈھولک۔ آم سے امبیا۔

فارسی کے اسم تصغیر یہ ہیں جو عموماً چہ۔ یزہ۔ و۔ ک جوڑ کر بناتے ہیں۔ یہ سب اسم کے آخر میں جوڑے جاتے ہیں۔ مثلاً

باغ سے باغ + یچہ = باغیچہ　　پسر سے پسر + و = پسرو

مشک سے مشک + یزہ = مشکیزہ　　مرد سے مرد + ک = مردک

طفل سے طفل + ک = طفلک　　عروس سے عروس + ک = عروسک

صندوق سے صندوق + چہ = صندوقچہ

کبھی بمعنی حقارت بھی مستعمل ہیں۔ جیسے کلو سے کلوا۔ جمن سے جمنا۔ ملو سے ملوا۔ مرد سے مردوا۔ جورو سے جوروا۔

اردو کے قواعد میں مصغر بنانے کے یہ آسان ضابطے اہلِ قواعد نے پیش کئے ہیں۔ اس سے قبل کہ اس ضابطے پر بنائے گئے لفظوں کے عمومی استعمال پر بحث ہو اس سے پہلے امامِ اہلِ سنّت نے جن الفاظ کو مصغر قرار دیا ہے اسے پیشِ نگاہ رکھیں تاکہ بزرگوں کی بارگاہ کے مجرم نہ ہوں

(۳) امام احمد رضا محدث بریلوی نے ان الفاظ کو تصغیر قرار دیا ہے۔

(۱) ناک سے ناکڑا (۲) مصحف سے مصیحف (۳) مسجد سے مسیجد (۴) مکھ سے مکھڑا (۵) آنکھ سے انکھڑی بصورتِ جمع انکھڑیاں۔

(۴) حضرت مولانا مفتی بدرالدین علیہ الرحمہ نے ایک طویل فہرست ''مقالہ نورانی'' میں پیش

کیا ہے یہاں چند مثالیں درج کروں گا۔

(الف) برائے حقارت:-

(۱) حاجی سے جیا (۲) مولانا سے مولنوا (۳) عالم سے علملی (۴) حافظ سے حفظلی

(ب) برائے محبت:-

(۱) بچہ سے بچوا (بچو) (۲) بہن سے بہنی (۳) بھائی سے بھیا

(ج) برائے جسامت:-

(۱) مکھ سے مکھڑا (۲) ناک سے ناکڑا (۳) چادر سے چدرا اچدریا (۴) نگر سے نگری یا نگریا (۵) آنکھ سے انکھڑیاں (۶) آنگن سے انگنوا (۷) ڈگر سے ڈگریا (۸) نظر سے نظریا۔ نجریا (۹) کمبل سے کملی یا کملیا (۱۱) بال سے بلوا۔

مندرجہ بالا کلماتِ تصغیر جو پیش کئے گئے ہیں اب ان پر اختلاف رائے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ علماً کے ایک طبقے سے تصغیر برائے محبت کے استعمال پر ایک رجحان ملتا ہے لیکن بیشتر علماً صیغہ تصغیر کا اطلاق مطلقاً ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ تصغیر کے متعلق اختلاف کی دو صورتیں ہیں ایک شرعی دوسرا لسانی۔ یہاں لسانیات کے نقطۂ نظر سے چند باتیں پیش کروں گا۔ اس سے قبل علماً کے دونوں طبقے کے نظریات بھی پیشِ نگاہ رکھیں۔

(۱) پہلا موقف ان علماً کا ہے جو قواعد اور لغات کے پیشِ نظر تصغیر کو بہر صورت ممنوع قرار دیتے ہیں اور دوسرے موقف کے علماً کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ جن الفاظ کو قواعد کے چند مخصوص اصولوں کے پیش نظر اردو زبان میں تصغیر کے الفاظ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ان میں اکثر مستقل اسماء کی صورت میں ہیں اور لغوی معانی میں توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ یہ الفاظ پوربی ہندی، اودھی، بھوجپوری زبانوں اور بولیوں کے مستقل الفاظ ہیں جنھیں اردو میں بھی استعمال کیا جارہا ہے تصغیر سمجھ کر نہیں بلکہ مستقل اسم جان کر شعراء اپنی نعتوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ بعض جلیل القدر علمائے کرام وصوفیائے عظام نے ان لفظوں کو اپنی نظم ونثر میں استعمال فرمایا ہے۔ اس لئے ان لفظوں

کے استعمال میں کوئی ادبی و شرعی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

(۲) اس کے برعکس متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں ان تمام الفاظ کو جنھیں کسی نہ کسی لغت میں تصغیر کہا گیا ہے، انھیں تصغیر ہی ماننے پر اصرار ہے اور نبی کریم ﷺ کی ذات و متعلقات کے لئے ان کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔لیکن اس سلسلے کی ایک اہم کتاب مفتی مطیع الرحمٰن مضطر رضوی کی ہے۔ جو دراصل ثالث کا رول ادا کرتی ہے۔اس کتاب میں نہایت مضبوط دلائل وشواہد سے اپنے درمیانی موقف کا اثبات کیا گیا ہے۔حضرت مفتی مطیع الرحمٰن نے الفاظ نا کڑہ، بکھڑا وغیرہ کو اپنی تحقیق سے مصغر ہی مانا ہے اور لفظ کملی کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اردو میں لفظ ''کملی'' مشترک ہے۔پہلے معنیٰ کے اعتبار سے وہ اسم مکبّر ہے اور دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے اسم مستقل بھی اور تصغیر بھی۔تو یہ متعین المعنیٰ ہوا، نہ ظاہر المعنیٰ اور نا ہی موہم المعنیٰ بلکہ مستقل اسم کے لئے راجح الاحتمال۔یا۔کم ازکم متساوی المعانی۔اس لئے عامۂ اہل سنت کی اصطلاح میں ''کملی والے'' کا لفظ حضور نبی کریم ﷺ کے خطاب کے طور پر مستعمل ہے۔لہذا حضور نبی کریم ﷺ کے تعلق سے اس کا استعمال ناجائز نہیں۔''

مگر اسکے باوجود پاکستان کے ممتاز اردو دانشور ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی نعت رنگ کے ایک شمارے میں اسی لفظِ ''کملی'' کے حوالے سے ایک دوسرا ہی نظریہ پیش کرتے ہیں

''یہ (کملی) مدثر اور مزمل کے مرتبۂ عالی کی ہندی شکل ہے وہ چادر جو وحی کے بارگراں کو سہل بنانے کے لئے تھی اس کو بھگتی کا رنگ دے کر یہ عاشقانہ روپ دیا گیا ہے......

آگے مزید لکھتے ہیں ۔معاذاللہ یہ چادرِ رسالت کو صوفی کی گلیم یا سادھو کی کملی سمجھتے ہیں''

ان جملوں پر مولانا کوکب نورانی زبردست گرفت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''کشفی صاحب کو ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے جانے کیوں نہیں خیال آیا کہ صوفی اور سادھو میں مناسبت بیان کرنا اور سرکار دو جہاں ﷺ کی مبارک کملی کا بیان اس تناظر میں یوں کرنا بھی تو ادب و تعظیم کے منافی ہے۔''......اس طرح کے لسانی اختلاف ہر عہد میں ہوتے رہے ہیں جیسا

کہ مولانا سید ہاشمی میاں صاحب اپنی کتاب میں خود اپنے ہی بزرگوں سے اختلاف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''مکھڑا کو چہرہ کا ہم معنی اور ایک مستقل لفظ نہ سمجھ پانے کی غلطی ہمارے بعض بزرگوں سے بھی ہوئی ہے اور چونکہ اس غلطی کا تعلق زبان وبیان اور عرف ولغت سے ہے اس لئے ان کی دینی عظمت اور شرعی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً ایک سوال کے جواب میں لفظ مکھڑا کو تصغیر لکھ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''مسئلہ ۷۔'' مجھے اپنا مکھڑا دکھا شاہ جیلاں'' میں لفظ مکھڑا کا استعمال ٹھیک ہے یا نہیں۔

الجواب:- یہ لفظ تصغیر کا ہے اکابر کی مدح میں منع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(عرفان شریعت حصہ دوم ص ۴۵۔۴۶)

دراصل مولانا ہاشمی میاں نے لفظ مکھڑا کو اردو زبان ولغت اور قواعد سے ہٹ کر سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی۔ اگر انھوں نے لسانی ارتقاء کے تصورات وخیالات کو پیشِ نگاہ رکھ کر اپنے موقف اظہار فرماتے تو بہتر ہوتا۔ ان کا خیال ہم معنی اور مستقل الفاظ کی تلاش میں عربی، فارسی، انگریزی، ہندی لغات اور مختلف بولیوں مثلاً پوربی، اودھی کی شاہراہوں پر سفر کرتا رہا جس سے ہم معنی اور مستقل اسماً کی قطاریں لگ گئیں جہاں اردو اکیلی پڑ گئی اس بھیڑ میں وہ لفظوں کی بناوٹ میں تصغیر کا عنصر نہ دیکھ سکے۔ جس زمانے میں اس لفظ کو تصغیر لکھا گیا وہ آج کا زمانہ نہیں بلکہ اردو کے ممتاز اساتذہ کا زمانہ تھا۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، ڈاکٹر محمد اقبال، جیسی ممتاز شخصیتیں ادبی اُفق پر ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

یہی سبب ہے کہ مشرقی شعریات کے نمائندہ نقاد بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب میں وضاحت فرمادی ہے کہ یہ لفظ تصغیر کا ہے اور دوسرے لغات بھی یہی کہہ رہے ہیں جیسا کہ پیش کردہ کلمات تصغیر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اردو زبان میں بعض الفاظ مشترک ہیں یعنی مصغر ومکبر دونوں حیثیتوں سے دیکھے جارہے ہیں بعض کی شہادت لغات میں بھی

موجود ہیں ۔اس مقام پر مولانا ہاشمی میاں سے اتفاق بہر صورت کرنا پڑتا ہے جیسا کہ مفتی مطیع الرحمٰن نے بعض الفاظ کے سلسلے میں اپنی کتاب میں تحریر فرمایا ہے ۔اب رہی بات اودھی بولیوں یا پوربی بولیوں کے الفاظ کے سلسلے میں ان کا کہنا کہ یہ الفاظ غیر مصغر اور مستقل اسماء ہیں تو اس سلسلے میں مفتی مطیع الرحمٰن کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں ۔

''واضح رہے کہ میری اس گفتگو کا تعلق اردو زبان سے ہے ۔رہیں وہ زبانیں یا بولیاں جن میں یہ الفاظ تصغیر کے نہیں بلکہ مستقل ہیں ان زبانوں اور بولیوں میں ان الفاظ کا استعمال ممنوع نہیں جیسے پوربی ،اودھی میں سجنوا، بجنا ،کمروا، کملیا،صورتیاں وغیرہ مستقل اسماء ہیں ۔سجن ،بجنی، کمرہ، کھمیا کی تصغیریں نہیں تو بارگاہ رسالت کے تعلق سے پوربی اودھی بولی میں ان الفاظ کا استعمال ناجائز نہیں ہوگا۔جس طرح ماں باپ سے اُف کہنے کی ممانعت باوجودیکہ قرآن میں منصوص ہے مگر علماء فرماتے ہیں کہ کسی قوم کی زبان میں یہ لفظ تعظیم کے لئے ہو تو اس زبان میں ماں باپ سے ''اُف'' کہنا ممنوع نہیں ہوگا۔ (تصغیر کی حقیقت ۔ص ۱۱۱)

مذکورہ خیالات کے پیش نظر چند باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ۔پہلی بات یہ کہ اردو میں استعمال ہونے والے الفاظ خواہ وہ اردو زبان کے ہوں یا کسی دوسری زبان کے جب وہ اردو زبان میں داخل ہیں تو ان کی پرکھ اردو قواعد وضوابط کی روشنی ہی میں ہوگی ۔لیکن اس سلسلے میں ہمیں دو بنیادی باتوں پر نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے ۔مثلاً اگر کوئی شخص پوربی، ہندی ،بھوجپوری زبانوں اور بولیوں میں نعت پاک لکھ رہا ہو تو ان زبانوں میں بھی تصغیر کا استعمال ان کی اپنی زبان کی روشنی میں غلط ہوگا اور اردو زبان کے ادبی اسلوب میں کہی جانے والی نعتوں میں تصغیر کی شناخت کا مسئلہ نہایت آسان ہے مگر عوامی لب ولہجے میں یا عوامی زبان جسے ہم صرف بولی کہہ سکتے ہیں زبان نہیں وہاں تصغیر کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے عرف کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے ۔بعض صاحبانِ فکر ونظر کی یہ رائے ہے کہ عرف اور محاورے کے سامنے اصول وقواعد بے اثر ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ فقہی احکام بھی بدل جاتے ہیں ۔

مولانا سید محمد ہاشمی میاں اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں،

''سامانِ بخشش'' صفحہ ۷۷ در منقبت حضور پر نور سیدنا علاء الملت والدین علی احمد صابر ﷺ جس میں مفتی آعظمِ ہند نے بلا جھجک ''رتیاں، سیّاں، چھتیاں، صورتیا، بتیاں، پیاں، بلما، بیّاں، اٹریاں، بلیّاں، گسیّاں اور سیّاں جیسے کلماتِ تصغیر کا استعمال کیا ہے'' یہ بات کہہ کر انہوں نے اپنے ہم عصر علماً کو مخاطب فرمایا ہے کہ وہ دیکھیں اور حکمِ شرع نافذ کریں "اس پر انکی پوری بحث ہے جو انہیں کے شایانِ شان ہے۔ میں تعظیمِ سادات کے پیشِ نظر صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس طرزِ تخاطب سے غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں حتیٰ کہ آپ کے ممدوحِ گرامی سیدنا مفتی آعظم پر کلماتِ تصغیر استعمال کرنے کا الزام آسکتا ہے حالانکہ ان کا دامن بے غبار ہے جس کی صفائی انہوں نے اپنے مضمون کے آخری حصے میں یوں پیش فرمایا ہے کہ ''مفتی آعظمِ ہند کے استعمال کردہ سارے الفاظ اودھی زبان کے قاعدے کے مطابق مستقل الفاظ ہیں انکا عرف نہایت شاندار اور جاندار ہے اور یہ سارے الفاظ کلماتِ تصغیر یعنی (DIMINUTIVE) نہیں بلکہ مقامی بولی کے الفاظ یعنی (DIALECT) ہیں''

دراصل قدیم اردو کے ایسے سینکڑوں الفاظ ہیں جو آج بھی ہماری بولیوں میں زندہ ہیں اور قدیم وجدید اصناف میں ان کے مزاج واسلوب کے مطابق برتے جارہے ہیں اردو رسم الخط میں پوربی بولیوں پر مشتمل مفتی اعظم کا یہ کلام گیت کے صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ اہلِ ادب جانتے ہیں کہ غزل کے اسلوب اور زبان وبیان میں قصیدے یا مرثیے نہیں لکھے جاتے ہر صنف کے لئے کچھ زبان، اسلوب، ہیئت اور مزاج مخصوص ہوتے ہیں۔ اہلِ علم وادب اور لسانیات کے مسائل سے واقفیت رکھنے والے ماہرین ہندوستان بھر میں (۱۶۵۰) زبانیں اور بولیاں بتاتے ہیں جن میں تقریباً ۴۰، ۴۲ ایسی زبانیں ہیں جن میں ادب لکھا اور پڑھا جارہا ہے۔ اس طرح ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر انداز ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے ہمیں اسی زاویئے سے دیکھنا چاہئے۔

میں سمجھتا ہوں اتنی تفصیل کے بعد مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں کیونکہ جہاں ادبی ولسانی

گفتگو کی مختلف جہتیں روشن ہو چکی ہیں وہیں حکم شرع سے بھی آگاہی ہو چکی ہے۔ باوجود اس کے امام احمد رضا محدث بریلوی کے ارشاد پیش کرتا ہوں۔

''ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کے تعلق سے صیغۂ تصغیر کا اطلاق مطلقاً ممنوع ہے اگرچہ بطور محبت ہو۔ بلکہ صیغۂ تصغیر کبھی مقدار کی زیادتی بتانے کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی مثالہماری زبان میں ناکڑا ہے جو ناک کی تصغیر ہے یہ لفظ صرف بڑی ناک کے لئے ہی بولا جاتا ہے مگر اس کے باوجود اس میں ابہام ہے جو ممانعت و حرمت کے لئے کافی ہے۔ بے شک ہمارے علماء نے مصحف کے لئے صیغۂ تصغیر مصیحف اور مسجد کے لئے مسیجد بولنے سے منع فرمایا ہے تو بعض وہ شعراء جو ہر نالے میں سرگرداں پھرتے ہیں وہ بے سوچے سمجھے نعت پاک میں مکھڑا، انکھڑیاں وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ان پر لازم ہے کہ اس سے باز رہیں۔'' (المعتمد المستند۔ بحوالہ تصغیر کی حقیقت)

☆☆☆☆☆☆☆
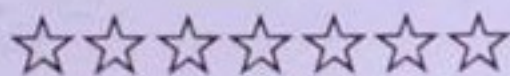
لفظِ مشترک

نعت گوئی میں لفظِ مشترک کے استعمال کا مسئلہ بھی نہایت دشوار ہے کیوں کہ بہت سے اختلاف اسی سے جنم لیتے ہیں اور مداح بے خبری میں وادئی ضلال تک پہنچ جاتا ہے۔لہٰذا ایک مداحِ رسول کے لئے ضروری ہے کہ لفظِ مشترک کے سلسلے میں وافر معلومات رکھے۔اردو زبان و ادب کے ممتاز محقق اور ماہرِ لسانیات رشید حسن خاں رقمطراز ہیں،

''اردو میں مشترک الفاظ اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔مشترک الفاظ سے وہ لفظ مراد ہیں جن کی تذکیرو تانیث میں اختلاف ہے۔یہ اختلاف کئی طرح کے ہیں۔کچھ لفظ تو دہلی ولکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آتے ہیں۔کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی دبستان کے بعض لوگ مذکر کہتے ہیں اور بعض مؤنث۔ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں مذکر تھا رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔یا اس کے برعکس، بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کے لغات میں یا متعلقہ کتابوں میں ایسی بہت سی تفصیلات موجود ہیں.....بہت سے لفظوں کی صورت یہ ہے کہ شروع میں اس کی تذکیرو تانیث کا تعین نہیں ہو سکا.....(اردو زبان اور قواعد ص ۱۵۶)

مذکورہ اختلاف کا تعلق لسانی ہے۔جس سے نعت نگاروں کو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔اس طرح کے اختلاف سے دین وایمان کا کوئی خسارہ نہیں مگر جس اختلاف کو نگاہ میں رکھنا نہایت لازمی ہے اور جس کی طرف علمائے دین نے متوجہ فرمایا ہے۔یعنی وہی لفظِ مشترک مگر اس کی یہاں دو صورتیں نظر آتی ہیں۔جس کے متعلق امام احمد رضا محدّث بریلوی ارشاد فرماتے ہیں،

''جب لفظ دو خبیث معنوں ایک اچھے معنی میں مشترک ٹھہرا اور شرع میں وارد نہیں تو ذاتِ باری پر اس کا اطلاق ممنوع ہوگا''.....اسی طرح علمائے دین فرماتے ہیں،

''سرکارِ کائنات کی مدح میں ایسا کلمہ استعمال کرنا ممنوع ہے جو چند ایسے معنی کے درمیان

متعارف ومشترک ہو کہ ان میں بعض معنی آپ ﷺ کے لئے زیبا وروا ہیں اور بعض نازیبا ونا روا۔ کوئی لفظ دو معنوں کے درمیان مشترک ہے ایک صحیح دوسرا فاسد"

ادبی لحاظ سے لفظوں کا فصیح اور غیر فصیح ہونا، متروک اور غیر متروک ہونا، متشابہ اور غیر متشابہ ہونا، متضاد اور غیر متضاد ہونا الگ الگ بحثیں ہیں۔ لغات اور قواعد کے مطالعے سے یہ باتیں آپ کے علم میں ہوں گی۔ ہم یہاں لفظِ مشترک کے سلسلے میں بات کرنے سے قبل یہ بات بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ نثری زبان میں اور شعری زبان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شعری زبان صنائعِ لفظی اور بدائع معنوی کی آغوش میں پروان چڑھتی ہے جسے بہت سی صنعتیں سہارا دیتی ہیں اور شعریت تب وتاب پاتی ہے ان باتوں پر توجہ رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ ہم نثری زبان اور شعری زبان کے درمیان معلق ہو جائینگے۔ لغات اور قواعد روز روز نہیں لکھے جاتے مگر زبان تو روزانہ لکھی اور پڑھی جاتی ہے جہاں دوسری زبانوں کے اثرات ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

شعری زبان کا عرف سمجھنے کے لئے اساتذہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن شرعی مسائل کی جانکاری کے لئے ہمیں علمائے دین کی طرف دستِ سوال بڑھانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ قرآن وحدیث اور احکامِ شریعت کی روشنی میں ہمارے مسائل کا حل نکالتے ہیں۔ جب آپ کسی لغت کا مطالعہ کرتے ہیں تو بعض الفاظ ایسے نظر آتے ہیں جن کے بہت سے معنی ہوتے ہیں مثلاً "رنگ" اپنے اصطلاحی معنوں میں سو کے قریب پہنچتا ہے یا پھر لفظِ "بات" اپنے معنوی وجود میں سو معنی دیتا ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اچھے اور برے دونوں قسم کے معنی رکھتے ہیں ایسے ہی الفاظ کو لفظِ مشترک کہتے ہیں اور یہی خدا ور سول کی مدح میں ممنوع ہوگا جیسے لفظِ "مجرد" کے بہت سے معنی ہیں ان میں ایک معنی قبیح بھی ہے اور ایسا ہی لفظ خدا اور رسول کے لئے استعمال کرنا سخت ممنوع ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ توہین اور تکریم کا معیار و مدار عرف پر ہے عرف اگر بہتر ہے تو ہم قاموس میں معنی تلاش نہیں کرتے شاعری لفظ سے نہیں لفظیات سے ہوتی ہے۔ ایک مقولہ مشہور ہے "کسی کی بولی کسی کی گالی کہیں کی بولی کہیں کی گالی" جہاں ایسی صورت نظر آئے ہمیں زبان اور بولی کے فرق کے ساتھ وہاں کی عرفیت پر جہاں کی بولی یا زبان ہے بڑی عمیق نظر کی ضرورت پڑتی ہے اس

کے علاوہ زمانی تغیرات اور بدلتی قدروں کو پیشِ نگاہ رکھ کر کوئی حکم یا فیصلہ کیا جاتا ہے۔☆☆

شاعرانہ تعلّی اور تحدیثِ نعمت

شعرائے کرام اپنی جولانیٔ طبع کے تحت کبھی کبھی تعلّی سے بھی کام لیا کرتے ہیں قدیم و جدید شاعری میں جسکی بے شمار مثالیں ملتی ہیں نعت شریف میں شاعرانہ تعلّی کا کیا جواز ہو سکتا ہے جب کہ عام فن پاروں میں بھی تعلّی کا استعمال گراں اور ناگوار محسوس ہوتا ہے زیرِ بحث موضوع پر ایک طویل مقالہ رشید وارثی نے نعت رنگ کراچی میں پیش کیا ہے میں کوشش کرونگا کہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے معروضات پیش کروں تا کہ شعرائے نعت کو آسانیاں فراہم ہو جائیں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب تعلّی سے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں۔

"تعلّی کے معنی ہیں شیخی، اپنی بڑائی خود کرنا، ڈینگ مارنا، اپنے تئیں سب سے اعلیٰ سمجھنا، حقیقت سے بعید دعویٰ کرنا، شاعرانہ جواز پیش کرنا"، شاعرانہ تعلّی میں اپنے یا اپنی شاعری کے بارے میں اظہارِ فوقیت کیا جاتا ہے۔ ولی، سودا، ناسخ، آتش، غالب، مومن، ذوق سب کے یہاں بے شمار تعلّی ملیں گی یہی اسکے لغوی اور اصطلاحی معنی ہیں"۔

شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے تعلّی کوئی خاص عیب نہیں بلکہ شاعرانہ حسن کا ایک حصّہ ہے دراصل شاعری میں تعلّی کی مختلف صورتیں ہیں کہیں تعلّی شاعرانہ حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہے کہیں اخلاقی و تہذیبی معائب سے تعبیر کی گئی۔ پہلے چند مثالیں دیکھئے پھر مزید گفتگو کی جائیگی۔

حیدر آغاز نگارش میرا　　غالب و میر کے انجام سے ہے　(حیدر بخش)

سیماب لفظ لفظ اترتے ہیں عرش سے　　میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے (سیماب اکبر آبادی)

دیوان جدید شاعری لایا ہوں　　فرقانِ حمید شاعری لایا ہوں

ختم الرسل شعر ہوں منجانب حق　　قرآن مجید شاعری لایا ہوں

(حکیم آزاد انصاری　تلمیذ حالی)

تعلّی کے لغوی واصطلاحی معنی ومفہوم کے پیش نظران مثالوں کودیکھیں تو حقائق سے دوراور کذب صریح واخلاقِ ذمیمہ سے قریب نظر آتے ہیں۔جسے شاعروادیب تعلّی کا نام دے کر بات بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔حقائق وصداقت کے حسن کوشاعرانہ حسن پرقربان کرنا صالح ادب کا خون کرنا ہے۔شاعرانہ تعلّی میں بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جہاں حقائق وصداقت کے حسن پر آنچ نہیں پہنچتی ہے۔اگراحتیاط سے کام لیا جائے تو اس عیب سے بچا جاسکتا ہے۔

صنف نعت کاتعلق صداقت وحقائق سے ہے،کذب ولغو سے اس کا کیا تعلق ،نعت عجزو انکسار کی امین ہے۔بیجا اور ناروا فخر ومباہات سے اس کا کیا واسطہ،نعت غرورِ نفس نہیں شعورِ نفس کا تقاضہ کرتی ہے،قرآن شریف میں کتنی سخت تاکید آئی ہے۔

ان اللہ لا یحب کل مختال فخورہ۔(سورۂ لقمان آیت نمبر ۱۸)

ترجمہ:(اللہ تعالی کسی بڑائی جتانے والے اوراظہارِ فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا)

تاجدار مدینہ سرور کون ومکاں ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہواور فرمایا کہ انسان اپنے غروراور خود پرستی میں بڑھتے بڑھتے اللہ تعالی کے یہاں جباروں میں لکھ دیا جاتا ہے (تفسیر کبیر)

مذکورہ قرآن وحدیث کے ارشاد کو پیشِ نگاہ رکھیں اور ہمارے نعت گوشعراء خصوصی طور پر ایسے اشعار سے اجتناب فرمائیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مدحتِ محبوبِ حق کا حق ادا تم نے کیا۔۔۔۔۔اے (تخلص) نذرِ محبت ہے تمہاری واہ واہ

ملائک خاک سے میری تیمم کرتے ہیں (تخلص)۔۔۔مجھے رتبہ ملا ہے یہ فقط نعت پیمبر سے

جہاں کسی کا تخیل نہ جاسکے (تخلص)۔۔۔۔۔میں لاکھ مرتبہ اس لامکاں سے گزرا ہوں

(تخلص) شاعر دربار مصطفےٰ میں ہوں۔۔۔۔عطا ہوئے ہیں مرے فکروفن کو لوح وقلم

کیا (تخلص) اس نعتِ گرامی کا اثر ہے۔۔۔۔اشکوں سے مرے ہوگئے جبرئیل کے پرنم

مذکورہ اشعار میں تعلّی اور غلو کی کیفیات نمایاں ہیں اشعار پڑھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔ان تمام

باتوں کے باوجود ہم کسی نعت گو شاعر پر طعن و تشنیع سے گریز کر رہے ہیں۔ ایک مسلمان دوسرے مومن بھائی سے اخلاص نیت اور حسن گمان رکھتے ہوئے دعوتِ اصلاح پیش کرے یہی زیادہ مناسب ہوگا۔
نعتیہ شاعری افکار و خیالات میں صداقت اور جذبات و کیفیات میں متانت کی امین ہے اس تقاضے کو پورا کرنا ہر نعت گو شاعر کی ذمہ داری ہے۔ اس مقام پر ایک خاص گوشے کی طرف اشارہ کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ سب دھان بائیس پسیری کرنے والے گندم نما جو فروشوں کی چاندی ہو جائے گی اور اس بہانے وہ ایک طرف نعتیہ شاعری کی تقدیس و عظمت کے ساتھ اکابرِ امت پر بیجا تنقید کر بیٹھیں گے اس لئے ایک محتاط روئیے کے تحت جہاں نعت گو شعراُ کی اصلاح ضروری ہے وہیں گمراہ فکر و نظر کے اسیر ناقدین کی فتنہ پردازیوں کے دروازے پر تالا لگانا بھی اشد ضروری ہے۔

دراصل نعتیہ شاعری میں تعلّی کا بیجا استعمال رواروی اور بے خیالی کی دین ہے۔ جسکی اصلاح کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ مگر بعض موقع پر یہی تعلّی اپنے دامن کی گرد جھاڑ کر سامنے آتی ہے اس کی کیا صورتیں ہوتی ہیں اس سلسلے میں نیاز فتح پوری نے ایک مقام پر اعلحضرت فاضل بریلوی کے متعلق لکھا ہے۔

''شعر و ادب میرا خاص موضوع اور فن ہے میں نے مولانا بریلوی کا نعتیہ کلام بالاستعاب پڑھا ہے ان کے کلام سے پہلا تاثر جو پڑھنے والوں پر قائم ہوتا ہے وہ مولانا کی بے پناہ وابستگی رسول عربی کا ہے ان کے کلام سے انکے بیکراں علم کے اظہار کے ساتھ افکار کی بلندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا کے بعض اشعار میں اپنی انفرادیت کا دعویٰ بھی ملتا ہے جو ان کے کلام کی خصوصیات سے ناواقف حضرات کو شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے فرمودات بالکل حق ہیں۔
(بحوالہ عاشق رسول ڈاکٹر محمد مسعود احمد، مطبوعہ لاہور)

یعنی کسی شعر میں شاعرانہ تعلّی کا گمان یوں بھی گزرتا ہے کہ جب شاعر کے کلام کی انفرادی خصوصیات اور اس کی علمی و عملی مقام و منزلت سے ناواقفیت ہوتی ہے تو اس پر تعلّی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ تعلّی کی پرکھ کے لئے شعری زبان، اسالیبِ سخن پر نگاہ رکھنا جہاں ضروری ہے وہیں شاعر کی ذاتی شخصیت اور علمی حیثیت کی خاطر خواہ معلومات بھی ضروری ہے فقط مبالغہ کا رنگ دیکھ کر مغالطہ میں

پڑ جانا بھی اپنی رسوائی کا سبب بن سکتا ہے۔
اب آیئے چند جملوں میں اس عنوان کے دوسرے پہلو پر غور کرتے ہیں۔تعلّی اور مبالغہ ایک طرف اور تحدیث نعمت کا اظہار دوسری طرف، جہاں تضاد کی کیفیت بھی ہے مگر اس کے درمیان ایک چیز قدرِ مشترک بھی نظر آتی ہے جسے اظہاری قوت سے تعبیر کرتے ہیں۔مثلاً تلوار کا کام کاٹنا ہے چاہے ظالم کو کاٹے یا مظلوم کو یہی تلوار جب حق وصداقت کی پاسبانی میں باطل کی سرکوبی کے لئے بے نیام ہوتی ہے تو اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے

تحدیثِ نعمت کے اظہار سے متعلق قرآن عظیم کا ارشاد ہے۔

'واما بنعمته ربک فحدث ' ترجمہ (اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہو)

ظاہر ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا بیان نہ کرنا کفران نعمت ہے۔شکران نعمت ایک مومن کے لئے لازمی ہے اس لئے اہل ایمان وعرفائے کاملین اپنے رب کے حضور سراپا شکرانے کی کیفیت میں رہا کرتے ہیں وہ ہر نفس یاد الٰہی میں مستغرق رہنا ایمان وعرفان کی آشنائی کا وسیلہ سمجھتے ہیں عرفائے کاملین فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بخشی ہوئی تمام نعمتوں کا جوہرِ خاص اور اصل کل نعمت حضور ﷺ کی ذات وصفات کا محور ومرکز ہے۔اللہ نے اپنے محبوب ﷺ کو تمام کائنات میں سب سے برتر وبالا بنا کر مبعوث فرمایا۔اپنے پیارے نبی کو اولین وآخرین کا مصدر ومنبع بنایا یعنی ان کی ذات کو کائنات کے لئے برزخ کبریٰ بنایا۔ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور ان کی محبوبیت کو اپنی محبوبیت قرار دیا اور عالم انسانیت کو حضور کے صدقے میں دین وایمان کی دولت سے سرفراز کیا۔گویا حضور ﷺ کی تعریف وتوصیف، تعظیم وتکریم بلواسطہ یا بلاواسطہ نعمتِ خداوندی کا شکرانہ ہے۔یعنی نعت شریف بھی بظاہر حضور رحمت تمام ﷺ کی مدح وثنا ہے مگر باطن میں بارگاہ رب العزت میں نشان عبدیت واداۓ محبوبیت کے رنگ میں رب کا شکرانہ ہے۔تحدیث نعمت کا اظہار ہر خاص وعام اہل ایمان کا شیوہ ہے لیکن ایک مومن شاعر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قدرت بیان اور شاعرانہ صلاحیتوں کی توفیق ودیعت کی ہے وہ اپنی اس خاص ودیعت پر اظہار شکرانہ کرتا ہے۔اس بیانیہ اسلوب میں عجز و

نیاز کی کیفیت والہانہ رنگ و آہنگ میں نظر آتی ہے وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کس منہ سے کہوں رشکِ عنادل ہوں میں ۔۔ شاعر ہوں، فصیح بے مماثل ہوں میں

حقا کوئی صنعت نہیں آتی مجھکو ۔۔ ہاں یہ ہے کہ نقصان میں کامل ہوں میں

میں تو کیا کوئی قلم کار نہیں لکھ سکتا ۔۔ مدحت سید ابرار نہیں لکھ سکتا

نعت لکھواتا ہے اللہ تو لکھ لیتا ہوں ۔۔ میں تو ایک لفظ بھی سرکار نہیں لکھ سکتا

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ مدحِ رسالت مآب ﷺ میں مبالغہ اور تعلّی کا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جذبۂ بے اختیار اپنے نفس کی تسکین کے لئے خودنمائی اور خودستائی کے دائروں سے مس ہو جاتے ہیں لہٰذا ان دونوں پہلوؤں پر سخت نگاہ رکھنی چاہئے۔ مبالغہ کا تصور بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر سے ختم ہو جاتا ہے اور تعلّی کا خیال مدّاح کے دل سے نعمت کبریٰ کے حصول پر نیاز و شکر کے جذبے سے تمام کیا جاسکتا ہے۔ اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ بعض مقام پر تعلّی اور غلو شعری حسن میں اضافہ کرتے ہیں کیونکہ گہرے اور تادیر اثرات قائم کرنے کے لئے اور کثیر معنویت کو پائیدار کرنے کی غرض سے ان جذبوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے تاکہ کلام بے نمک نہ ہو جائے مگر ہمارے بعض ناقدین محض چند اوپری سطحوں پر سرسری نظر ڈال کر تنقید بے جا کر جاتے ہیں یہی سبب ہے کہ علمائے کرام کی باریک بیں نگاہیں ہمیں محتاط روی اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

علمأ فرماتے ہیں کہ تعلّی کا استعمال عام طور پر ناروا اور بیجا سمجھا جاتا ہے مگر کچھ مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ جہاں تعلّی کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے مثلاً علمی و اخلاقی انحطاط کے سخت ماحول میں اہل علم و عرفان کو بطور تحدیثِ نعمت اپنے علم کا اظہار و اعلان کرنا تاکہ لوگ متوجہ ہوں اسے تعلّی نہیں کہا جاسکتا، کذب بیانی اور خلاف واقعہ باتیں اور چیزیں ہیں صداقت و حقائق کو غلو اور تعلّی کی ضرورت نہیں۔ دراصل تحدیثِ نعمت کے اظہار میں حسنِ نیت کا بڑا دخل ہوتا ہے اسی لئے حدیثِ پاک میں فرمایا گیا "عمل کا دارومدار نیت پر ہے" یعنی اچھی نیت پر ثواب کا مژدہ اور نیت کے فتور پر گناہ.............
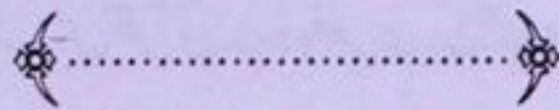
حسن تخاطب

نعت گوئی میں طرزِ ادا یا اسلوب و بیان کی بے پناہ قدر و قیمت ہے۔ ان میں دیگر بیانیہ کے رنگ و آہنگ سے قطعِ نظر حسن تخاطب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ تخاطب کے سلسلے میں قرآن عظیم میں شدید تاکیدیں آئی ہیں۔ اگر ایک طرف لفظِ راعنا پر روک لگائی گئی تو دوسری طرف حجروں کے باہر سے آواز دینا بھی بے عقلی اور بے شعوری سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد باری تعالٰی ہے۔

(ا) ''اے ایمان والو اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند نہ کرو۔ اور انکے حضور زور سے باتیں نہ کرو۔ جس طرح تم آپس میں چیخ کر باتیں کرتے ہو اس طرح کرنے سے کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

(ب) تم رسول کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہراؤ جیسا کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

(ج) یقینا جو آپ کو حجرے کے باہر سے پکارتے ہیں اکثر عقل نہیں رکھتے۔''

مذکورہ آیات قرآنیہ کے شانِ نزول کی کیفیت کو پیشِ نگاہ رکھیں اور محبوبِ کونین ﷺ کی تعظیم و تکریم اور آداب و تہذیب کے متعلق احکاماتِ ربانی کو پیشِ نظر رکھیں اس کے بعد صحابہٴ کرام کی محبت اور تعظیم کے مناظر کو دیدہٴ فکر و نظر سے ملاحظہ فرمائیں تو ہمارے لئے علمی اور عملی دونوں حیثیت سے طریقہٴ بیاں کے اسباق روشن ہو جائیں گے۔

نعت گوئی میں ایک مداحِ رسول کو ان باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ زبان اور بیان کے سارے قرینے مذکورہ احکامات قرآن ہی کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں۔ بارگاہِ نبوت و رسالت میں حسنِ تخاطب کوئی آسان کام نہیں ہے۔ طرزِ تخاطب کے بہت سے قرینے ہیں ان میں براہِ

راست طرزِ تخاطب کا مرحلہ نہایت نازک اور دشوار تر ہے۔ ہر آن یہی احساس رکھنا کہ ہم جس ذات بابرکات سے مخاطب ہو رہے ہیں یہ کسی بادشاہِ وقت کا دربار نہیں بلکہ احمد مختار کونین کے تاجدار اور محبوب پروردگار کا آستانۂ عرش وقار ہے یہاں الفاظ و معانی کے ساتھ اندازِ بیاں کے لئے قرآنی احکامات ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ہمارے ذہن و قلب میں اُبھرنے والے جذبات و احساسات اور افکار و خیالات جو صورتِ اظہار سے قبل ہی دربارِ نبوت میں منعکس ہو جاتے ہیں، آج بھی محبوب کی دہلیزِ محبت سے گزرنے والی ہوائیں ایک خاص قرینے اور ادب کے سانچے میں ڈھل کر گزرتی ہیں۔ جہاں بڑا سے بڑا تاجور بھی سر خمیدہ نظر آتا ہے بڑا سے بڑا سخت جان انسان بھی اپنے حواس کو قابو میں رکھ کر گزرتا ہے ایک ادب شناس مدّاح کی نگاہ جہاں طائرِ سدرہ کے بال و پر کو برائے تعظیم سمٹتا ہوا دیکھتی ہے۔ اس بارگاہ میں نفس گم کردہ کی کیفیت سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو طرزِ تخاطب ہم ایک دوست سے، ایک آشنا سے، ایک دنیوی محبوب سے ایک قومی بزرگ اور روحانی استاذ کے لئے درجہ بدرجہ اختیار کرتے ہیں وہ تمام تعظیمی و تکریمی انداز و آداب سے بڑھ کر ہونا لازمی ہے۔ اسی در پر عرفان و ایمان کے نازک جذبے تخلیقی عمل کی ہمرکابی میں شرعی دائرے میں اپنی پلکوں سے الفاظ چنتے ہیں اور بکمال عجز و انکسار کے ساتھ عرض گزار ہوتے ہیں۔

سرکار ہم گنواروں میں طرزِ ادب کہاں
ہم کو تو بس تمیز یہی بھیک بھر کی ہے (رضا بریلوی)

اردو نعت میں طرزِ تخاطب کے مختلف رنگ و آہنگ نظر آتے ہیں چند اشارات ملاحظہ فرمائیں جس میں استمدادیہ اور ندائیہ انداز کا ایک قرینہ ہے جو دور و نزدیک کے فاصلے سمیٹ دیتے ہیں اور جذبے کو زبان عطا کرتے ہیں۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے (الطاف حسین حالی)

جاگ او یثرب کے میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تیری امت کا راج (ظفر علی خاں)

اُٹھ اے اُمت کے والی کفر دھمکاتا ہے مسلم کو
علی کو حکم دیں لیکر وہ آئیں ذوالفقار اپنی (شفیق جونپوری)

اس طرزِ تخاطب میں جو درد و کسک ہے اُسے بیان کرنے کی حاجت نہیں سوزِ محبت اور وفورِ جذبات کی کیفیات محسوس کی جاسکتی ہیں۔ مسلمانوں کی زبوں حالی اور ظلم و ستم کی یورشوں نے شاعر کو اضطرابی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے اگر یہ طرزِ خطاب قوم سے براہِ راست ہوتا تو بھی شاعر کی دردمندی کا اظہار ہو سکتا تھا مگر شاعر روئے سخن براہِ راست آقا و مولیٰ ملجا و ماویٰ کی طرف کرتے ہوئے عرض گزار ہے جو بہر صورت ایک مستحسن امر ہے لیکن اِن پہلوؤں کے ساتھ ظفر علی خاں اور شفیق جونپوری کے استغاثہ میں لفظوں کا نامناسب استعمال بھی نظر آتا ہے۔ ظفر علی خاں نے ''جاگ او یثرب کے میٹھی نیند کے ماتے،، نہ جانے کس طرح کہنا گوارہ کیا اور شفیق جونپوری نے ''اُٹھ اے اُمت کے والی،، جیسے اندازِ تخاطب کو برتا۔ بہر نوع مجھے کسی شاعر کے اخلاصِ نیت پر کلام ہرگز نہیں شوریدہ ماحول میں پُر اضطراب لب ولہجہ تو فطری طور پر پیدا ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی ہمیں یہ احساس ہمہ وقت ہونا چاہئے کہ ہم جس بارگاہِ عرش وقار میں اپنی وارداتِ قلبی کا اظہار کر رہے ہیں وہاں زبان و بیان کے سارے تقاضے بطرزِ احسن پورا کرنا ضروری ہے۔
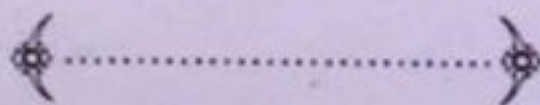
اردو نعت چند تنقیدی مباحث

نعتیہ شاعری کے موضوعات سے متعلق ایک مختصر سی گفتگو ہو چکی ہے جس میں ناقدین کے خیالات کی روشنی میں بہت سی باتیں سامنے آچکی ہیں۔ اگر ان مباحث کو ترتیب دی جائیں تو باتیں بہت طول پکڑ سکتی ہیں مثلاً

(۱) نعت کا موضوع کیا ہے؟

(۲) نعت کے مشروع اور غیر مشروع موضوعات کیا ہیں؟

(۳) نعت کے خارجی موضوعات اور داخلی موضوعات کیا ہیں؟

(۴) نعت کے عصری موضوعات اور آفاقی موضوعات کیا ہیں؟

(۵) نعت کے مجرد موضوعات اور شعری موضوعات کیا ہیں؟

مذکورہ عنوانات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج صنفِ نعت کی مختلف جہتوں اور معنوی امکانات پر غور وفکر کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ جب بحث و مباحث کا دور چلتا ہے تو کچھ سوال اُبھرتے ہیں کچھ جواب پاتے ہیں اور کچھ تشنۂ جواب رہ جاتے ہیں پھر انہیں جوابوں سے نئے سوالات اُبل پڑتے ہیں زندہ شعور کی یہی کہانی ہے۔ مردہ اذہان نہ سوالات کر سکتے ہیں اور نہ جواب دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ اس خوش گوار تبدیلی سے فروغِ نعت گوئی کو نئی تقویت مل رہی ہے۔ آیئے اس سلسلے کی گفتگو کو نئی نسل کے تازہ کار اذہان سے جوڑ کر فرضِ کفایہ ادا کرنے کی سعادت حاصل کریں۔

مذکورہ نکات پر گفتگو ایک مختصر سے مقالے میں پیش کرنا بہت دشوار ہے اس لئے انہیں ایک سوال بنا کر اپنے معروضات عرض کروں گا۔ اہلِ قواعد نے موضوع اور مہمل کی تفریق سے بے معنی اور بامعنی لفظوں کی تفہیم کا راستہ آسان کر دیا ہے کہ ہم کتاب وتاب، قلم ولم، کاغذ واغذ، جیسے الفاظ سے بامعنی اور بے معنی الفاظ کو الگ کرنے کے اہل ہو گئے۔ جہاں قواعد کا علم رہنما ثابت ہوا لیکن ابھی دو قدم راستہ چل سکے تھے کہ موضوع کے درمیان سے کئے سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے جس کی

طرف پانچ سوالات پر اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو ان کے اشارات روشن نظر آئیں گے۔

اردو زبان و ادب میں ایک خاموش انقلاب ۱۸۵۷ء کے آس پاس نئی کروٹوں کے ساتھ صورت پذیر ہو رہا تھا۔ سرسید کی تحریک سے وابستہ اذہان ذاتی جذبہ و احساس اور کلاسیکی روایت کو نئے موضوعات سے ہم کنار کرنے لگے۔ حالؔی، شبلی، محمد حسین آزاد نے بدلتی قدروں اور عصری مسائل کے پیشِ نظر نئے نئے اسالیب، نئی ہیئتوں اور نئے موضوعات پر اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔ جس سے شعر و ادب کا رشتہ فردیت کے بجائے اجتماعیت یا اصطلاحاً داخلیت کے بجائے خارجیت سے جڑ گیا۔ مسدس حالی سامنے آیا اور سرسیّد کی نیچریّت کو ایک پلیٹ فارم مل گیا یہیں سے اردو نعت کے موضوعات میں اعتقادی اختلاف کا دروازہ کھل گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر مسلمانوں کے سیاسی زوال اور اخلاقی انحطاط کا عنوان دیا گیا۔ حضور کی سیرت کو آئینہ بنا کر اصلاحِ معاشرہ کی طرف توجہ دی جانے لگی اسی کے ساتھ داخلی موضوعات جس کا رویہ سراپا نگاری اور ذاتِ رسول سے انفرادی رنگ و آہنگ میں جذبات، کیفیات اور احساسات کو پیش کرنے کی روایت تھی اس طرزِ سخن کے خلاف ایک رجحان چل پڑا۔ اضطرابی دور میں پیدا ہونے والے مسائل پر غیر جذباتی انداز اور معروضی طرز پر غور و فکر سے کام نہ لیا جاسکا نعت کے موضوعات پر سوالات بیدار ہوئے کسی نے محدود اور غیر محدود کی بحث اٹھائی کسی سے داخلی موضوعات اور خارجی موضوعات پر طویل باتیں ہوئیں۔ نعت اور اس سے منسوب ہونے والے موضوعات پر بحث و تمحیص سے پہلے یہ سوچنا ضروری تھا کہ ہم جس چیز کو اہم اور جس چیز کو غیر اہم کہنے کی جرأت کر رہے ہیں اسکا رشتہ کس سے ہے اسکی عظمت اور تقدس کا لحاظ ہر آن ضروری تھا، مگر جذباتی ردِ عمل کے طوفان نے ان رشتوں کا لحاظ اس اعتبار سے نہیں کیا جس کا وہ متقاضی تھا۔ کسی نے سیرت النبی کو عنوان بنایا کسی نے میلاد النبی کو، حالانکہ اکائی کی ایسی تقسیم دنیا میں پہلی بار دیکھی گئی۔ ایک طرف آزاد ہندوستان کی تحریک اور دوسری طرف قومی اور ملکی مسائل اور اس کے درمیان دو قومی نظریہ یعنی تقسیم در تقسیم کا ایک سلسلہ اور اس کے اثرات و نتائج اردو زبان و ادب میں نظم اور غزل کی باضابطہ ایک تقسیم کا قرینہ خارجی اور داخلی موضوعات کے تحت پہلے ہی موجود تھا۔ ہیئتی تقسیم موضوعاتی اور غیر موضوعاتی رنگ میں بھی ابھر آئیں۔ جسکی آغوش میں ہنگامی مسائل پروان

چڑھے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک ابھر کر سامنے آئی قومی، ملی، سماجی ملکی و اصلاحی قرینے پہلے سے ہی موجود تھے، انہیں ایک مخصوص سیاسی مینو فیسٹو کا اسٹیج دیکر روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ غریب و مزدور کی آواز بنادیا گیا، مذہب کا عمل دخل ختم کرنے کی کوشش اور مارکسی نظریات کی توسیع، اس دائرے میں نعت کو کب گوارا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہر تحریک کا آغاز اسکے انجام کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کچھ دان پردان کے بعد ہی جدیدیت کی گونج ایوانِ ادب میں سنائی دینے لگی۔ جہاں سے موضوعاتی شاعری اور علامتی شاعری کا منظر نامہ سامنے آنے لگا۔ جس اجتماعیت کا خواب دیکھا گیا آنکھ کھلتے ہی یاس و ناامیدی اور کربِ ذات کی تعبیریں الگ الگ نظر آنے لگیں۔ فردیت کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر ہوا سے باتیں کرنے لگی اس ماحول نے مذہب کی اہمیت کا احساس زندہ کیا، مگر پوری طرح مذہب کی معنویت کو بروئے کار نہ لانے والا رجحان مابعدِ جدیدیت کی صورت میں پر تول رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کی فردیت آخر کب تک اپنی ذات کے نہاں خانے میں تنہائی، یاس اور ناامیدی کا نوحہ کرتی، اب اسے محسنِ انسانیت کی عالمگیر رحمتوں کا خیال آنے لگا ہے۔ مابعد جدیدیت اگر ان آفاقی اور روحانی قدروں کی تلاش میں بے سمتی کا شکار نہ ہوئی تو اسے ایک عظیم انقلاب کا امین کہا جائیگا۔ ہم نے تجربوں کی صلیب پر ایک زمانے تک انسانی وجود کو بار بار اترتے اور چڑھتے دیکھ لیا ہے۔ اب ہمیں تجربوں کے تلخ اور ترش حقائق و واقعات سے نئی حیات کو رحمت کے شامیانے میں بلا کر اسکے زخموں کا علاج بھی کرنا ہے، اگر یہ کام جدید تر نعت گوئی کے حوالے سے ہو تو اس سے بڑھ کر محسنِ انسانیت کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت کوئی نہیں۔ یہاں تک جن باتوں کو نہایت اختصار کے ساتھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے اور اشارات سے کام لیتے ہوئے جو مدعا بیان ہوا ہے اسکا اصل مقصد نعتیہ شاعری سے متعلق تنقیدی مباحث کو نئے حقائق میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ سب سے پہلے اپنی فکر و نظر کی بے سمتی کو ایک ایسی سمت پر ٹھہرانا ضروری ہے جہاں سے رحمت و انوار کی کرنیں صراط مستقیم دکھاتی بھی ہیں اور چلاتی بھی ہیں پس ایمان و ایقان کے ساتھ مکمل اعتماد ذاتِ رسول کی سچی نسبت و محبت سے حاصل کرنی ہوگی۔ اس دائمی آفاقیت کا احساس زندہ رکھنا ہوگا۔ آئیے اپنے موضوع کی طرف مراجعت کرتے ہیں، ناقدینِ شعر و ادب نے حمد و نعت کو موضوعاتی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔

چلئے مہمل گوئی سے صاف بچ نکلے۔ ایک لحاظ سے اصناف سخن اور موضوعات سخن دونوں صورتوں میں ہم نعت کی انفرادیت کا اعتراف کر چلے ہیں۔ ایک زمانے تک غیر صنفی کہنے والے اب ایک باقاعدہ صنف تسلیم کرنے لگے ہیں۔ پہلے موضوعاتی شاعری سے تعبیر کیا گیا پھر اسے محدود اور غیر محدود بھی کہا جانے لگا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کی طرح تنقید کے مہرے پچھتے رہے ایک مثال ملاحظہ فرمالیں،

مغربی بنگال کے کہنہ مشق بزرگ شاعر جناب علقمہ شبلی کی کتاب جو حمدیہ و نعتیہ رباعیات پر مشتمل ہیں اس کے مقدمہ نگار ڈاکٹر کلیم سہسرامی کا ایک جملہ "حمد و نعت کے موضوعات محدود ہیں"

اس جملہ پر ڈاکٹر افغان اللہ نے برسوں بعد علقمہ شبلی کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے بجا طور پر اعتراض کیا اور خوب جواب دیا۔ ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"عظیم شاعری کی پہچان بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ عظیم شاعری وہ ہوتی ہے جو کسی محدود موضوع کو اپنے فن سے لامحدود بنا دیتی ہے لیکن علمائے ادب اس مقام پر خاموش نظر آتے ہیں کہ اگر موضوع خود ہی لامحدود ہو تو ایسے موقع پر عظیم شاعری کیا کرتی ہے یا عظیم شاعر کیا کرتا ہے۔۔۔

نعت گو شاعر کے سامنے یہ مشکل آن کھڑی ہوتی ہے کہ اُن کے سامنے لامحدود موضوع ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی ترقی تو دور کی بات ہے یہی غنیمت ہے کہ موضوع ہی کو صحیح صورت میں پیش کر سکے اس مقام پر زبان اور قلم دونوں کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اگر ایسا کرنے میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو سکا تو اس کی شاعری عظیم شاعری کی مثال ہوگی،،

ایک دوسرے مقام پر رقم طراز ہیں،

"حمد و نعت جس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں وہ موضوعات ہی لامحدود ہیں تو پھر ان اصناف کے موضوع کو محدود کیسے کہہ سکتے ہیں دراصل محدود ہماری اپنی یا شاعر کی نظر یا اسکا فن ہوتا ہے جو صرف اس خاص موضوع کے سامنے پہنچ کر اپنے آپ کو بے بس اور مجبور پاتا ہے۔ کیونکہ (مبالغہ کے ذریعہ) محدود کو لامحدود (اپنی عقل و فہم کے مطابق) بنا کر پیش کرنا آسان ہے مگر لامحدود کو محدود کرنا انسانی فکر کے بس کی بات نہیں،،

مذکورہ بالا اقتباس گرچہ طویل ہو گیا ہے مگر بیحد کام کی باتیں سامنے آئیں ہیں اس مقام پر

شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک اقتباس پیش کردوں تاکہ مزید معنویت کے امکان روشن ہوسکیں۔

''ہر بڑی شاعری میں یہ وسعت ہوتی ہے کہ ہزار مطالعہ وتجزیہ کے بعد بھی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بات ابھی ایسی باقی ہے، جس کے وجود کا احساس تو ہمیں ہے لیکن وہ چیز گرفت میں نہیں آرہی ہے،،

اس عبارت کو پڑھکر ایک لمحہ کے لئے ذرا سوچئے جب ہماری بڑی شاعری کا یہ کمال ہے تو کائنات کی سب سے عظیم سچائی کے ادراک کا عالم کیا ہوگا جو ہماری نعتیہ شاعری کا عظیم موضوع ہے جسکے سلسلے میں آپ پہلے ملاحظہ کر چکے ہیں مگر اسی مقام پر نفس موضوع پر سوال قائم ہوتا ہے، موضوعاتی شاعری کی مخالفت میں اصل شاعری کی تلاش اور پھر مجرد موضوع کی اہمیت سے انکار اسکے بعد شعری موضوع پر اصرار کا منظر نامہ بھی دیکھتے چلیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب لکھتے ہیں،

''میں موضوع کو شاعری کے حسن کا بنیادی حصہ نہیں سمجھتا کیونکہ موضوع کو شاعری سے الگ کر کے دیکھنا میرے لئے ناممکن ہے۔ جب یئٹس،، لیڈ،، اور ہنس جیسے فضول موضوع پر لافانی نظم لکھ سکتا ہے تو اس میں یقیناً مجرد موضوع کی کوئی خوبی نہیں ہے اگر آپ ''اسلوب'' کی خوبی پکڑلیں تو سب مسائل آپ سے آپ طے ہو جاتے ہیں۔ نظم کی ہیئت سے جو تاثیر ابھرتا ہے میں اس کو موضوع کہتا ہوں: مجرد موضوع پر زیادہ توجہ نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسی طرز و مزاج کے تمام شاعروں میں موضوعات کی مماثلت لازمی ہے،،

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا خیال اپنی جگہ میں یہاں موضوع اور ہیت کے اختلاف میں پڑنا نہیں چاہتا نظم کی ہیت سے ابھرنے والے تاثر کو اور مجرد موضوع کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ نعت کے کسی موضوع کو معمولی سمجھ کر صرف نظر کر جانا اپنے ایمان واسلام کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ یہی خطا ڈیڑھ سو برس سے نور وبشر کے مسئلے میں ہوتی چلی آرہی ہے۔ جب کہ دونوں پہلو ذات نبوت سے وابستہ ہیں۔ ان میں کسی پہلو کی نفی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر اثبات میں بھی اس مرکزی نقطہ پر توجہ مرکوز رہنی چاہئے کہ تحقیر وتوہین کے شائبہ سے پاک صاف ہو۔ تاثر میں معنویت کے امکانات در اصل زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ کسی کلیدی لفظ کو پکڑ کر معنی کی پرتیں کھولتے چلے جائیں۔

یہ باتیں دراصل اس دور کی ہیں جب نعتیہ شاعری وحمدیہ شاعری کی تحقیق وتنقید کی فضا موجودہ عہد کی طرح نہیں تھی۔ کبھی کبھی تنقیدی موشگافیاں کسی سمت سے ہو جاتی تھیں۔ نعتیہ شاعری پر تنقید کرنا گناہ عظیم تصور کیا جاتا تھا۔ مگر آج کل ایک پوری جماعت مختلف رویئوں میں تنقید کی میزان لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ ادبا اور ناقدین کے خیالات اور افکار پر بھی تنقید در تنقید کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ جس کے سبب فکر ونظر اور علم وشعور کی مختلف جہتوں اور نوعیتوں سے آشنائی ہو رہی ہے مثلاً حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''نعت اور آداب نعت،، نعت رنگ میں شائع ہونے والے مقالات پر علمی اور شرعی محاسبہ ہے۔ اسی میں ایک مقام پر ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری کے ایک مقالہ کا ذکر کچھ اس طرح ہے۔

''ڈاکٹر آزاد صاحب نے نعت کے ''ثانوی موضوعات،، کے عنوان سے ایک مختصر فہرست ۱۱۶ صفحہ پر ترتیب دی ہے اور خود اپنی تحریر کے آخر میں لکھتے ہیں اور ہر وہ موضوع، موضوع نعت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کو آقائے دو عالم رحمتِ دو جہاں ﷺ سے کسی نہ کسی قسم کا علاقہ، رشتہ یا نسبت ہو،،

اس اقتباس کو نقل کر کے مولانا کوکب نورانی اپنا خیال پیش کرتے ہیں،

''موضوعاتی نعتوں کے ساتھ کیفیاتی اور وارداتی منظومات بھی ہیں۔ میرے کریم رحمت اللعلمین آقا ﷺ کی خصوصیت اور اوصاف کا کوئی شمار ہی نہیں تو موضوعات کی حد بندی کہاں ممکن ہے،،

ہمارے علمائے ادب اپنی آسانیوں کی خاطر درجہ بندی، حد بندی اور خانہ بندی کرتے رہے ہیں تا کہ کسی گوشے پر جب گفتگو ہو تو مواد کی فراہمی سوال نہ بن جائے۔ پھر ہماری کاوشِ فکر ونظر عظیم نعتیہ موضوع سے الگ الگ حصے بناتی ہے۔ اگر ایک طرف ہم کہتے ہیں موضوعات کی حد بندی کہاں ممکن ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر اسماعیل آزاد کی طرح ثانوی موضوعات کی فہرست مرتب کرتے ہیں اور مولانا کوکب صاحب قبلہ، موضوعاتی نعتوں کے ساتھ کیفیاتی اور وارداتی منظومات کے اضافہ کی طرف نشاندہی بھی فرماتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری نارسائیاں اور کبھی کبھی مجبوریاں ہوتی ہیں تا کہ ہم کسی خاص گوشے پر بہتر سے بہتر انداز میں اپنی کاوشیں پیش کر سکیں مگر سب کچھ کے بعد اعتراف عجز

ونیاز ہی سرنامۂ سخن بنتے ہیں۔

اسی طرح دس بارہ سال قبل جناب شمس بدایونی نے ایک مختصری کتاب ''اردو نعت کا شرعی محاسبہ'' کے نام سے لکھی تھی اور موضوعاتِ نعت کو ''مسلکی خانہ بندی'' کے تحت دو حصوں میں تقسیم کیا اور مشروع اور غیر مشروع موضوعات کے نام سے ایک فہرست مرتب کر ڈالی مگر انھوں نے پہلے اپنے طور پر ایک ضابطہ بیان کیا اسے ملاحظہ فرمائیں۔

''ہر وہ موضوع جو بالتحقیق شریعت محمدی کے خلاف ہے غیر مشروع ہے اس اصول کے تحت نعت کے مروجہ موضوعات میں سے بیشتر کے غیر مشروع ہونے کا سبب شعراء کی جامد تقلیدی ذہنیت اور شعری جذباتیت ہے۔ ذیل میں ایسے تمام غیر مشروع موضوعات کا جو شرعی محاسبہ کیا جا رہا ہے اس میں متذکرہ بالا عوامل کارفرما نظر آئینگے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق غیر مشروع موضوعات یہ ہیں۔

(۱) آپ ﷺ کا مختار کامل ہونا (۲) قاب قوسین کا تصور (۳) حضور کی محبوبیت (۴) آپ ﷺ کا علمِ غیب (۵) آپ ﷺ کا نور من نوراللہ ہونا اور نور ہونا (۶) آپ ﷺ کا سایۂ مبارک کا نہ ہونا (۷) حضور کا سبب تخلیق کائنات ہونا (۸) عرش اعظم کا تصور (۹) یم کا پردہ (۱۰) حضور کا تقابل دیگر انبیاء کے ساتھ (۱۱) جبرئیل امین کو حضور کے در کا دربان کہنا''

شمس بدایونی کی یہ کاوش ان کے نظریات اور مسلکی تعصبات کو تقویت ضرور پہنچا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے پرکھوں کی روایت کو زندہ کیا ہے، ایک دور غیر منقسم ہندوستان میں ایسا بھی گزرا ہے جب نعت گوئی اور درودِ تاج کے ورد کو مشرکانہ کہا گیا تھا۔ اسی روش پر چلتے ہوئے شمس بدایونی نے ایسے موضوعات تلاش کئے ہیں جن پر علمائے دیوبند اور علمائے بریلوی کے درمیان سخت اختلاف ہیں۔ برسوں مناظرہ اور مجادلہ ہوتے رہے ہیں۔ دونوں جانب سے اپنے اپنے موقف کی تائید و حمایت میں سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں شمس نے جن اکابر علمائے دین و مفتیان دین متین کے اشعار پیش کئے ہیں وہ محض شاعر نہیں بلکہ شریعت وطریقت کے تاجدار اور امامِ وقت گزرے ہیں۔ کسی نعتیہ شعر کی من مانی تشریح اور اپنے مخصوص خود ساختہ نظریئے کی عینک سے دیکھ کر فیصلے صادر کرنا کسی

اہل علم کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی نظرِ تحقیق غیر مشروع موضوعات کو باتحقیق شریعتِ محمدی کے خلاف ثابت نہ کر سکے کیونکہ سینکڑوں دلائل و براہین اس کی صحت کی شہادت دے رہے ہیں۔ مجھے ان کے اصول کے اختلاف نہیں مگر کسی اصول کو بے اصولی کے ساتھ استعمال کرنے پر اختلاف ہے۔

کچھ اسی نہج پر ۲۰۰۴ء میں ایک کتاب جناب ناوک حمزہ پوری نے لکھی ہے۔ نعتیہ شاعری اور اسکے آداب یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے جسکے مندرجات کچھ اس طرح ہیں۔ نعتیہ شاعری کے عنوان سے مضمون قدرے طویل ہے جس میں کوئی خاص عملی و تحقیقی بیان نہیں ایک سرسری جائزہ ہے جس نے کبھی نعت سے متعلق کچھ نہ پڑھا ہوان کی قدرے رہنمائی ہوسکتی ہے دوسرا مضمون غیر مسلم شعرا اور ان کی نعتیہ شاعری کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں صرف ایک خاص بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر سید شاہ محمد طلحہ رضوی برق جیسے معتبر محقق و ناقد اور ایک عظیم روحانی خانقاہ کے سجادہ نشیں کی رائے سے اختلاف کیا ہے کہ "بغیر اعلان قبولِ حق اس زبانی جمع وخرچ کا کچھ حاصل نہیں یہاں بھی نذرِ آتش، وہاں بھی نذرِ آتش"، ناوک صاحب اردو معاشرے کے جمہوری فکر کے حامی ہیں وہ نعت گوئی کے شرائط میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتے نعت کو محض صنفِ سخن سمجھتے ہیں جب کے مسلمان شعرا صنف نعت کو عبادت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جناب ناوک حمزہ پوری کو خدا جانے کس نے مفتیٔ ادب کے لقب سے نوازہ ہے وہ عالم دین اور مفتیٔ دین ہرگز نہیں قوانینِ شریعت میں ایسے لوگوں کے لئے سخت وعیدیں ہیں۔ بزعم خویش مفت کے مفتی بننا آج کل عام ہوتا جارہا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ عالمِ اسلام کی عبقری شخصیت پچاسوں علوم وفنون کے مالک، ہزار سے زائد کتابوں کے مصنف فقیہ اسلام امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ پر مسلکی تعصب کی بنا پر الزام و بہتان لگانے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"نعتیہ شاعری کا جب بھی جہاں بھی ذکر ہوگا مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ذکر کرنا لازمی ہو جائے گا۔ نعت گوئی ان کا اوڑھنا اور بچھونا رہی ہے۔ عشقِ رسول میں خود رفتگی کی وجہ سے حمد و نعت کے مابین کا فرق گرچہ کبھی کبھاران کی تخلیقات میں برقرار نہیں رہا ہے لیکن یہ سہواً ہوا معلوم ہوتا ہے اور ان کی محبتِ رسول میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔"، صفحہ ۳۰

ایک دوسرے مقام پر اس طرح رقم طراز ہیں،

''آدابِ نعت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے، مشہور نعت گو حضرت مولانا احمد رضا خاں مرحوم نے لائحہ عمل کی نشاندہی فرمائی تھی۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ۔۔۔۔بے جا سے ہے المنۃ اللہ محفوظ

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی۔۔۔۔یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

یعنی قرآن سے آداب نعت گوئی سیکھنے کا دستور العمل سبحان اللہ اپنے اس دعوے پر خود انہوں نے کہاں تک عمل کیا یہ بات موضوع بحث بن سکتی ہے اور لوگوں نے اس سلسلے میں بحث کی بھی ہے لیکن میں بحث و تکرار سے دامن بچاتے ہوئے پھر کہتا ہوں کہ دوسرے تمام نعت گو شعرأ کے لئے اس سے بہتر نسخہ کیمیا تو ہو ہی نہیں سکتا،، صفحہ ۶۲، ۶۳

ناوک حمزہ پوری ہوں یا شمس بدایونی یہ اردو کے ادیب و ناقد اور شاعر ہو سکتے ہیں مگر اسلامی علوم و فنون سے ان کا دامن خالی ہے آدمی کو اپنی حیثیت میں رہ کر کلام کرنا چاہئے۔ انہیں قرآن شریف کی کسی آیت کا اردو میں ترجمہ کرنے کی بھی سکت نہیں ایسے لوگوں کی کسی بات کو اہمیت دینا اگرچہ فضول ہے مگر ان کی اوقات بتانا بھی ضروری ہے تاکہ انکی گمراہ کن باتوں میں سادہ لوح الجھنے سے محفوظ رہ سکیں۔ یہاں تک میں نے تنقیدِ نعت کی بے سمتی کو دو مخصوص مکاتبِ فکر کے نظریئے میں دیکھا ہے۔ اب ایک تیسری سمت کی طرف چلتے ہیں۔ پیش رفت ۲۸ جولائی ۲۰۰۵ء کا شمارہ پیش نظر ہے، طفیل مدنی کی نعتوں کا مجموعہ ''دل ریزہ ریزہ،، پر ان کے ایک پرانے دوست ڈاکٹر حسن الہ آبادی نے طویل تبصرہ مضمون کی صورت میں کیا ہے جسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ اس نعتیہ مجموعے کی تقاریظ لکھنے والے مولانا علی میاں ندوی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی جیسے لوگوں نے دل کھول کر شاعر اور ان کی نعتیہ شاعری پر لکھا ہے۔ ظاہر ہے ان عالموں کو شرک، کفر، بدعت اور ضعیف احادیث کا علم جتنا ہوگا ویسا علم عام ادیب و ناقد کو شاید ہی حاصل ہو اور جب انہوں نے طفیل مدنی کی نعتیہ شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی اپنی تقاریظ قلمبند کئے ہوں گے مگر اس کے برعکس ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کو مدنی صاحب کی نعتوں میں شرک خفی، شرک جلی، بدعات اور ضعیف احادیث کے عناصر

اور نمونے نظر آ گئے۔

اب اس بھیانک جرم کا مجرم کس کو قرار دیا جائے، مدنی صاحب پڑھے لکھے شاعر ہیں ان کو شرک کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے یا اس کتاب پر فراخدلی سے تقاریظ لکھنے والوں کو مجرم بنایا جائے، کیا تقاریظ لکھنے والے عام ادیب و ناقد ہیں؟ کیا علومِ اسلامیہ اور قوانین شریعت ان کی نگاہ میں نہیں؟ ظاہر ہے مولانا ابوالحسن ندوی اور مولانا عبداللہ عباس جیسی شخصیتوں سے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا پھر بھی ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی نے کفر وشرک کے نمونے دکھا دیئے۔ شاید ان کے نزدیک شرکِ خفی، شرکِ جلی، بدعت، ضعیف احادیث وغیرہ کی کوئی دوسری حیثیت ہوگی یا انہوں نے اپنی طرف سے من مانی طور پر ان چیزوں کی تعریف متعین کر رکھی ہو، ایک جگہ لکھتے ہیں

''بریلوی مکتبِ فکر کے لوگوں کی بات جانے دیجئے، دیوبندی مکتبِ فکر کے اکثر علماء بھی عقیدۂ توسل اور برزخی نہیں بلکہ آپ کے حیاتِ جسمانی کے قائل ہیں''

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ دو مکاتبِ فکر کے بعد کوئی تیسری جماعت بھی ایسی ہے (وہابی) جو ان عقائد کو شرک سے تعبیر کرتی ہے۔ یہ وہی پھلجھڑی ہے جسے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''تقویت الایمان'' کے مقدمے میں لکھ کر جلایا ہے۔ آج انہیں کے دامن تک چنگاریاں پہنچ رہی ہیں۔

جل گیا دامن تو پھر اظہارِ بیزاری نہ کر
ہم نہ کہتے تھے چراغوں کی طرف داری نہ کر

اس مقام پر ہمیں نعتیہ شاعری کی تنقید میں مسلکی تنقید اور نظریات کے دروازے کھلتے نظر آ رہے ہیں ادبی نظریاتی تنقید کا عام حشر ہم دیکھ چکے ہیں، میں ادبی نقاد اور اسکی ادبی تنقید کی ایک مثال آگے آنے والے مضمون میں پیش کروں گا جس سے آپ یہ اندازہ کر سکیں گے کہ ادبی نقاد لاکھ صاحب نظر اور گہرا علم وشعور رکھتا ہوا گر وہ باضابطہ عالم دین نہیں ہے تو نعتیہ شاعری میں کلام کرنے کے دوران تسامحات کا شکار ہو سکتا ہے۔

نعتیہ شاعری کی تنقید اور مسلکی وابستگی

اردو زبان و ادب میں نظریاتی تنقید کی سرد و گرم روایت سے ادب کا سنجیدہ قاری خوب واقف ہے۔ مشرقی اور مغربی نظریات و رجحانات کے ان مباحث میں ایک زمانے تک مصروفِ کار اربابِ فکر و نظر کو کیا ہاتھ آیا، کس نے کیا کھویا اور کس نے کیا پایا اس حساب کتاب میں کون جائے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ سے وابستگان اس کھاتا بہی اور ناپ تول میں نہیں پڑتے مگر ادب کی خودمختار سلطنت میں راج سنگھاسن حاصل کرنے والے اسکی خودمختاری کی کہاں کہاں سوداگری کرتے ہیں اسکی کہانی بہت عجیب و غریب ہے۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ یہ کاروبارِ ادب صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے، اس نظریاتی آواگون سے ایک دوسری ہی صورت پیدا ہوگئی ہے خیر کے پہلو میں شر اور شر کے پہلو میں خیر کو دیکھنے کی بے محابہ کوششیں جاری ہیں یہ اور بات ہے کہ پریشاں نظری کچھ اور بھی پریشان ہوگئی جہاں نظریاتی تصوّرات کے تصادم سے مغلوب ہوکر تمام نظریات کو رد کرنے کا سلسلہ چل پڑا ان میں چاہے اچھے ہوں یا برے مفید ہوں یا غیرِ مفید بھی کے خلاف باتیں ہونے لگیں ایسے سوالات اکثر ابھرتے رہے ہیں جن پر مباحث بھی ہوتے رہے ہیں۔ اعلیٰ اقدار اور اسکی مہذب ترجمانی کے نام پر افادی ادب، جمالیاتی ادب، سیاسی و ملکی مسائل پر مشتمل ادب غرض کہ بیسیوں اقسامِ ادب سے ہم آشنا ہو چکے ہیں۔

آج بھی آخری کوئی صورت متعین نہ ہو سکی بس طبعی ادب کے نام سے سندِ اعتماد حاصل کرنے والا ادب ہی ادب ہے باقی سب ادب کی بیساکھیاں ہیں۔ خیر ان باتوں کو یہاں پیش کرنا لاحاصل ہے۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے چند ادب کی فروعی باتیں منہ کا مزہ بدلنے کی غرض سے کہہ کر گزر رہا ہوں۔ ہر عہد اپنے ساتھ ایک رجحان لے کر ابھرتا ہے۔ پہلے رجحان پیدا ہوتا ہے اس کے بعد نظریہ معرضِ وجود میں آتا ہے، اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ رجحان ایک تخم ہے اور نظریہ ایک

پوداپھول اور پھل عقیدہ، یہ موسمی باتیں ہیں جسکی روشنی میں ایک اہم مسئلہ کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔

دنیا میں ہزاروں نظریات ہیں ہم کس کے پیچھے چلیں یہ اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ اگر ایک مسافر کسی چوراستے میں چلنا چاہتا ہے تو تمام عمر اسے دوڑتے رہنے کے باوجود منزل نصیب نہ ہو سکے گی۔ اسلام نے ہمیں نظر بھی دیا اور نظریہ بھی، راستہ بھی دیا رہنما بھی، چلنے کا سلیقہ بھی دیا اور منزل کا پتہ ہی نہیں بلکہ منزل بھی دیا ہے۔ جب کہ دنیا میں جتنے بھی نظریات ورجحانات ہیں ان میں بیک وقت ساری چیزیں نہیں مل سکتیں۔

اسلام میں ایمانیات واعتقادات میں کوئی نظریاتی کشمکش نہیں، قرآن نے جو نبی ورسول کی ذات کو جس نظریئے سے متعارف کیا ہمیں اس نظریئے کی پابندی کرنی ہوتی ہے، ہمیں اپنی نظر سے رسول کو دیکھنے کی بے جا جسارت سے روک دیا گیا۔ ہمیں نبی کی ذات وصفات اور محامد ومحاسن کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کا پابند کیا گیا ہے کیونکہ عام بشری نظر سے نبی ورسول کو دیکھنے والوں میں کفار و مشرکین ہی تھے جو ایک طرف بشری اوصاف کے تحت صادق اور امین بھی کہہ رہے تھے اور دوسری طرف کاہن وجادوگر اور مجنوں جیسی غیر انسانی افعال کی تہمت بھی لگارہے تھے۔ اگر وہ اصحاب رسول کی نظر سے رسول سے متعلق نظریہ قائم کرتے تو شاید اہل ایمان میں شامل ہوجاتے مگر ایسا نہ ہوا، آیئے ہم اپنے عہد کے تناظر میں اس نظریاتی کشمکش کا ایک منظر ملاحظہ کریں جس میں اہل سنت وجماعت کے بالمقابل فرقۂ وہابیہ اور فرقۂ نیچریہ کے نظریات وخیالات کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا جو توحیدِ خالص کے نام پر تنقیصِ رسالت کرنے سے ذرہ برابر نہیں چوکتے۔ انھیں اصلاحِ فکر واعتقاد کے نام پر مسلمانوں کے دین وایمان پر شب خون مارنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ان کا بہت پرانا طریقہ یہ ہے کہ جو آیات کفار ومشرکین کے حق میں نازل ہوئے ہیں، انھیں مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں حتیٰ کہ وحدانیت ورسالت کے باب میں ذاتی اور عطائی کے فرق امتیاز کو فراموش کرتے ہوئے اپنا خود ساختہ نظریہ کے تحت عظمتِ انبیاء اور شانِ اولیاء کے لیے آیاتِ نفی کا خوب استعمال کرتے ہیں اور سینکڑوں آیاتِ اثبات کو فراموش کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں مگر دعویٰ خوب کرتے ہیں جیسا کہ ایک مقام پر

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمتہ نے جناب عامر عثمانی کو لکھا تھا مولانا مودودی نے بھی کہیں اسی طرح کے خیال کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا ہے

''میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے،،

علامہ ارشد القادری رقم طراز ہیں،

''برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ سنتِ رسول سے منحرف کرنے کے لئے جس اسپرٹ میں منکرینِ حدیث گفتگو کیا کرتے ہیں اور ائمۂ مجتہدین کے ساتھ ہماری ذہنی وابستگی کے خلاف اہلِ حدیث حضرات نے جو شیوہ اختیار کر رکھا ہے کم وبیش وہی طریقہ اکابرِ امت سے ہمیں بے تعلق کرنے کے لئے آپ حضرات استعمال فرما رہے ہیں۔ جہاں تک قرآن وسنت اور اللہ ورسول کے ارشاداتِ عالیہ کو مرکز فکر بنانے کا سوال ہے اس حقیقتِ کبریٰ سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن دراصل بحث قرآن وسنت کے الفاظ وعبارت میں نہیں ان کے مدلولات ومفاہیم میں ہے۔ غیر منصوص مسائل میں دلائل کے استخراج اور نصوص کے معانی ومطالب کے تعین کا مرحلہ بغیر اشخاص ورجال کی رہنمائی کے نہیں طے پا سکتا،،

اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو نعتیہ شاعری کے نظریاتی مباحث کا سلسلہ بہت دراز نظر آئے گا۔ جناب ظہیر غازی پوری کا اندازِ نظر ملاحظہ کریں

''نعتیہ شعر وادب کا مطالعہ کرتے وقت اکثر جگہوں پر نظر رکتی ہے۔ بعض افکار کو ذہن قبول نہیں کرتا، لیکن کہیں کہیں اپنی کم علمی یا بے بساطی کا بھی گمان گزرتا ہے،، (نعت رنگ)

اس اقتباس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں پہلی بات یہ ہے کہ بعض افکار کو ذہن قبول نہیں کرتا اس کا صریح مفہوم یہی ہوا کہ نعتیہ شعر میں پیش کردہ افکار بعض قابل قبول ہوتے ہیں اور بعض نا قابل قبول مگر یہ قبول ونا قبول کا فیصلہ ہمارا ذہن نہیں کر سکتا۔ شریعت کے مطابق اگر افکار ہوں تو ذہن کا فیصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر بعض افکار شریعت کے خلاف ہوں مگر ہمارا ذہن اسے قبول کرتا ہے تو یہ بات بھی نا قبول ہوگی۔ نعتیہ شاعری میں فیصلہ شریعت کا ہوتا ہے طبیعت کا نہیں۔ دوسرا جملہ واقعی

ناقدین ادب کی نارسائی کا کھلا اعتراف ہے۔بعض ناقدین عام شاعری کی طرح نعتیہ شاعری کی تحقیق وتنقید میں حدِ فاصل برقرار نہیں رکھتے۔عام ادب پاروں پر اظہارِ فکر وخیال کی آزادی روا رکھنے کے سبب مذہبی فکر وشعور کی روشنی میں اپنے علمی افلاس کا ثبوت فراہم کر جاتے ہیں اس کے باوجود چند صاحبانِ قلم ایسے بھی ہیں جو ضروریاتِ نعت کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی فطری کاوشات سے نواز رہے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے اپنے مضمون میں دو مثالیں درج کی ہیں میں انہیں کے حوالے سے پیش کرتا ہوں۔

(۱) توحید کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد سے (افراط)

(۲) مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اسکا اور ایلچی بھی (تفریط)

پہلے شعر کے کفرِ صریح ہونے میں بڑے سے بڑے محتاط اہل فتویٰ کو تأمل نہیں ہوسکتا اور دوسرے شعر کے منصب رسالت کے منافی ہونے میں کسی اہل علم ودانش کو تذبذب نہیں ہوگا۔جب کہ ڈاکٹر وحید اشرفی کچھوچھوی رقم طراز ہیں۔

''نبی اور ایلچی ایک دوسرے کے مترادف نہیں اور یہاں نبی کو ایلچی کہنے کی ضرورت نہ تھی جب کہ یہاں قافیہ کی بھی تنگی نہ تھی اور یہاں مصرع میں بڑی آسانی سے بجائے ایلچی کے نبی کا لفظ لایا جاسکتا ہے''

اردو نعت کی تنقید وتحقیق کے نام پر آج ناقدین کے منفی رویئے سے عام قاری بھی مضطرب نظر آتا ہے۔خالص ادبی وفنی سطح پر نظریاتی اُتھل پتھل بھی دیکھی جارہی ہے۔مولانا حالی کے اعلان پر ''حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں'' کی تلقین کے بدترین نتائج آئے دن دیکھنے کو مل رہے ہیں۔مغربی اقوام بذات خود احساس کمتری کا شکار ہوکر اپنی نارسائی کو جدید تجربوں کا نام دے کر دنیا میں پھیلا رہی ہیں ایٹم کا کاروبار کرنے والے ایک چنگاری سے خوفزدہ نظر آرہی ہیں۔بہر نوع ہم اہل ایشیا مغربی مفکرین کے خیالات اور

ان کے بچھائے ہوئے دام میں الجھ کر رہ گئے ہیں اردو ادب میں اس طرح کی اندھی تقلید ڈیڑھ سو سال سے ہو رہی ہے۔ ہمارے آج کے لکھنے والوں تک مغرب کے یہ خیالات، تحریکیں اور نظریات اس وقت پہونچتے ہیں جب یہ خود مغرب میں مسترد ہو چکے ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

"یہ نظریات امریکہ کے سرمایہ دار نظام پر قائم ہیں نئے فیشن کی طرح مال کی مانگ بڑھاتے ہیں۔ مختلف یونیورسیٹیاں نظریہ پسند پروفیسروں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی تنخواہیں پیش کرتی ہیں۔ طلبہ اس یونیورسٹیوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جہاں نظریہ ساز پروفیسر کاروبارِ تدریس انجام دیتے ہیں خالص تاجرانہ ذہنیت کا ترجمان ہے"

ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے ایک بڑا ہی ایمان افروز جملہ لکھا ہے۔

"عقائد وایمانیات کے باب میں نظریۂ جمہوریت بھی کام نہیں آسکتا۔ کسی شاعر نے ایک لاکھ اشعار کہے ہوں، ان میں ننانوے ہزار، نوسو ننانوے اشعار بالکل بے غبار ہوں صرف ایک شعر میں شاعر نے لفظی یا معنوی سطح پر ٹھوکر کھائی ہو تو سب پر پانی پھر جائیگا۔ یہ دلیل کام نہیں آسکتی کہ شاعر نے اسکے علاوہ تمام اشعار نہایت ایمان افروز اور روح پرور کہے ہیں"

یہی شعر اس موقعے پر یاد آتا ہے۔

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

جس طرح نعتیہ شاعری میں بعض شعراء افراط وتفریط کے شکار ہوتے ہیں اسی طرح ہمارے بعض ناقدین شعر و ادب بھی افراط وتفریط سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ اگر چند اشخاص اس سے مستثنیٰ ضرور ہیں جنہوں نے توازن واعتدال کی راہ اپنائی ہے مگر بیشتر حضرات اپنے علم وفہم اور استعداد کے مطابق تنقیدی مضامین لکھ رہے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری لکھتے ہیں،

"متقدمین ومتوسطین شعرائے نعت نے اس صنف میں بہت سے معائب ونقائص شامل کر دیئے ہیں جو منبعِ نعت کے منشأ کے خلاف تھے۔ انہوں نے پیغمبرِ اسلام کے لئے عاشقانہ الفاظ استعمال کئے

معانی سے زیادہ الفاظ پر زور دیا۔ معجزات کے بیان میں مستند اور غیر مستند کے فرق کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا اور بہت سے ایسے معجزات نظم کر دیئے جو فرضی اور موضوع تھے۔ انہوں نے صحیح واقعات اور مستند روایات کی صورت بھی مسخ کر ڈالی اور حضور کی سیرت اور آپ کے پیغامات کے مقابلے میں سارا زور آپ کی مقدس و منور صورت اور آپ کے سراپا کو موضوع سخن بنانے میں صرف کر دیا،،

مذکورہ بیان نعت رنگ کے شمارے میں نظر سے گزرتے ہی ڈاکٹر طلحہٰ رضوی برق کی اردو زبان میں اردو نعت کے حوالے سے لکھی جانے والی پہلی کتاب کا یہ اقتباس ذہن کے پردے میں ابھر آیا، واضح ہو کہ یہ کتاب ۱۹۷۰ء کی تصنیف ہے اور ڈاکٹر اسماعیل کا بیان تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہے شاعری میں سرقہ اور توارد کی مثالیں عام ہیں مگر تنقید میں اس عیب کو کس حسن کا نام دیا جائے۔

ڈاکٹر طلحہٰ رضوی برق رقم طراز ہیں،

،،شعرائے متاخرین کی نعت گوئی میں فرق و مراتب کے باوجود ذیل کی خصوصیات مشترک ہیں

(۱) رسول اللہ ﷺ کی شان میں عاشقانہ الفاظ وصل و ہجر، فراق اور بے تابی وغیرہ کا استعمال کیا گیا اور اسی حیثیت سے آپ کے خد وخال، زلف و گیسو، لب و دہن اور چہرہ و رخسار وغیرہ کی تعریف و توصیف کی گئی

(۲) معنیٰ سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا یعنی جدید استعارے پیدا کئے گئے اور رعایتِ لفظی وصنعتِ تضاد وغیرہ سے بھی کام لیا گیا

(۳) بہت سی ضعیف روایتیں اور معجزات نظم کیے گئے

(۴) شاعرانہ مبالغہ طرازیوں میں صحیح واقعات اور مستند روایات کی صورت بھی بدل گئی ،،

ان دونوں اقتباسات کا اگر تقابلی جائزہ لیا جائے اور روایت اور درایت کی روشنی میں پرکھی جائے تو چند مشترک اوصاف کے ساتھ نظریاتی ٹکراؤ کا ایک منظر بھی کھلتا نظر آئے گا۔ حالی کے حوالے سے ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری کا جارحانہ نظریہ تمام شعرائے متقدمین و متوسطین کی خدمات پر پانی پھیرتا نظر آتا ہے جب کہ حالی سے زیادہ قابلِ احترام شعراءٔ گزرے ہیں۔ حالی کی خدمات کو سراہنا کوئی

عیب نہیں ان کی خدمات بہر طور کرنی چاہیے مگر یہ کیا ضروری ہے کہ حالی کی محبت میں بدحال ہو کر تمام متقدمین و متوسطین پر غلط الزامات و بہتات لگائے جائیں ۔ دراصل ہمارے ناقدین بذاتِ خود توازن واعتدال کی راہ سے دور جا پڑے ہیں اسی طرح ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی باتیں جس میں ضعیف روایتوں اور معجزات نظم کرنے کی بات آئی ہے اور شاعرانہ مبالغہ طرازیوں میں صحیح واقعات اور مستند روایات کی صورتوں کے بدلنے کا محض ذکر ہے کوئی ثبوت نہیں اس طرح ایک عام قاری اردو نعتیہ شاعری کی خوبیوں اور خامیوں سے متعلق کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے میں اپنی اس گفتگو کو مولانا کوکب نورانی کے خیالات پر موقوف کرتا ہوں جو اردو نعت کے حوالے سے تمام ناقدین و محققین کے لئے درسِ تازیانہ ہے

" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر شاعر کی کہی ہوئی نعت ، حمد ، منقبت وغیرہ کو صرف یہ کہہ کر قبول نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حمد و نعت و منقبت بالائے تنقید ہے بلکہ اسے حقیقت اور عقیدہ و عقیدت کے صحیح تقاضوں سے متصادم یا متضاد پا کر ہی نقد و جرح کا ہدف بنایا جا سکتا ہے اور ایسا ہونا چاہیے کیوں کہ حمد و نعت میں احتیاط کا ہر تقاضہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے لیکن عشق کو شرک اور محبت کو بدعت کہنے والوں کے پیمانے پر نہیں بلکہ ادلۂ شرعیہ کے مطابق تصحیح و تنقید ہو اور ایسا کرنے والا بھی دیانت و صداقت کا پاس دار ہو اور علمِ نافع میں توازن رکھتا ہو۔ وہ لوگ جو ناسخ و منسوخ آیات و احکام ، اقسامِ حدیث ، اصولِ حدیث ، نقدِ رجال ، استخراج و استنباط وغیرہ سے واقف نہیں ، خود محدث و مفتی نہیں ، انہیں ان حوالوں سے زبان و قلم دراز کرنے کی کیا ضرورت؟

وہ اپنے عقیدہ و مسلک کے حوالے سے کسی عملی شخصیت پر اعتماد کرتے ہوں اور ان کو حجت سمجھتے ہوں تو اس کی تحریروں سے اقتباس نقل کر دیں تا کہ خود ناقل ذمہ دار نہ ٹھہرے اور نعت رنگ کو اعتقادی اختلاف کے مباحث کا ملغوبہ بنانے کا مرتکب نہ ہو ، اسی طرح جواب دینے والے کو بھی سہولت ہو اور قارئین پر بھی واضح رہے کہ کون سی بات صرف مسلکی وابستگی کے حوالے سے ہے اور کون سی تنقید و تحقیق کے حوالے سے ہے

لفظ نعت ۔۔ ایک جائزہ

تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ جس سے حقائق و معلومات کی تازہ ہوائیں آتی رہتی ہیں کوئی دس بارہ سال قبل میں نے ایک مقالہ ''صنفِ نعت ایک تجزیاتی مطالعہ،، کے عنوان سے سپردِ قلم کیا تھا اس وقت مطالعے کے لئے خاطر خواہ کتابیں بھی نہیں تھیں جس کے سبب لفظِ نعت سے متعلق اپنی معلومات دلائل کے ساتھ لکھنے سے قاصر رہ گیا۔ فی الحال میرے سامنے دو مسائل ایسے ہیں جن کا جواب لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلا مسئلہ ہے ایک ناقد کا خیال ہے۔

''نعت ابتدائی عربی شاعری میں ہر خاص و عام کی مثبت تعریف کے تحت ملتی ہے، اوائل میں فارسی شعراء نے بھی رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدحت نعت کی صورت میں کی گئی،،

اس اقتباس میں ابتدائی عربی شاعری اور اوائل میں فارسی شعراء کی قید اگر نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو بہت سے دشوار مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہ ابتدا یا اوائل کی بات تھی مگر بعد کے ایام میں کیا یہی صورت رہی کیا وہی عام و خواص کی مثبت صورتیں تھیں یا کچھ اختصاص کا پہلو بھی نکلا۔۔۔۔ یہ باتیں عربی اور فارسی کے علمائے محققین زیادہ بہتر بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں یہ صورت حال ابتدا ہی سے مختلف ہے۔

(ا) ناوک حمزہ پوری لکھتے ہیں۔

''نعت ایک عربی الاصل لفظ ہے اس کے معنیٰ توصیف، ثنا، مدح وغیرہ کے آتے ہیں۔ عربی لغات کی پیروی میں فارسی اور اردو کے مؤلفین نے بھی تو یہی معنی بیان کئے ہیں لیکن اس میں ستائش رسول کا اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ غیاث الغات کے مطابق یہ توضیح ملتی ہے اگرچہ لفظ نعت بمعنیٰ مطلق وصف است لیکن اکثر استعمال ایں لفظ بمعنیٰ مطلق ستائش وثنائے رسول آمدہ است۔

لغات کشوری میں لکھا ہے۔

تعریف، صفت، تعریف کرنا، خاص کر صفتِ رسول اللہ ﷺ۔

فیروز اللغات میں ہے۔

مدح، ثنا، تعریف وتوصیف، مجازاً رسول خدا احمد مجتبیٰ کی تعریف۔

ناوک حمزہ پوری ان معنوں کو لکھنے کے بعد اپنا خیال پیش کرتے ہیں

''مجھے غیاث اللغات کے معنٰی میں ''اکثر، لغات کشوری کے معنٰی میں ''خاص کر،، اور مولوی صاحب کے مجازاً پر اعتراض ہے۔۔۔۔۔۔ جہاں تک اردو زبان وبیان کا تعلق ہے صورت حال یہ ہے کہ لفظِ نعت صرف اور صرف پیغمبر آخر الزماں کی مدح کے لئے مخصوص ہے۔

(۲) ڈاکٹر سید جمیل الدین راٹھوی لکھتے ہیں۔

''اردو لغات میں اگر چہ عربی وفارسی کی پیروی میں نعت کا لفظ مطلق وصف اور ثنائے رسول ﷺ دونوں معنٰی میں آیا ہے مگر جیسا کہ نور اللغات کے مرتب نے لکھا ہے کہ یہ لفظ بمعنٰی مطلق وصف ہے لیکن اس کا استعمال آں حضرت ﷺ کی ستائش وثنا کے لئے مخصوص ہے۔ اردو زبان وادب میں مطلق وصف کے معنٰی میں اس کا استعمال قریب قریب ناپید ہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد علی خان کی مثنوی ''قصہ زیتون ومحمد حنیف، میں لفظِ نعت کا صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی منقبت کی جگہ عنوان میں استعمال ہوا ہے،

(۳) ڈاکٹر سراج بستوی لکھتے ہیں۔

''مندرجہ بالا سطور میں مختلف قاموس اور لغات کے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔ صرف ایک نعت کے لئے، نعت محمد ﷺ کا حوالہ ملتا ہے۔ عربی زبان میں جتنی بھی نعتیں کہی گئی ہیں ان میں سرنامہ کے طور پر مدح رسول اللہ یا مدحیہ رسول اللہ ﷺ ملتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ مدحِ رسول کو نعت کا سرنامہ اردو والوں کی دین ہے۔

(۴) مولانا عبد القدوس لکھتے ہیں۔

''قرآنِ مجید میں اس مادے کا کوئی صیغہ نظر نہیں آیا ہے۔ احادیث میں دو تین جگہ یہ لفظ آیا ہے

اور ہر جگہ خوبیوں کے بیان کے لئے آیا ہے ۔ کرمانی ، شرح بخاری اور طیبی شرح مشکوٰۃ میں یہ علامہ طاہر محمد الفتی نے اپنی مشہور کتاب ،،مجمع بحار الانوار ،، (لغات حدیث) میں بھی اسی وجہ سے مادہ ن، ع، ت کا ذکر کیا ہے (ماہنامہ نعت)

پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں۔

''نعت عربی زبان کا لفظ ہے اور لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم محض مدح وثنا اور تعریف وتوصیف ہے، خواہ وہ کسی کی بھی ہو۔ مگر اب اسے فخر عالم وآدم رسول اکرم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے اوصاف بیان کرنے اور انکی بارگاہ میں التماس والتجا کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اب کسی اور کی تعریف کو نعت نہیں کہہ سکتے چاہے وہ باعتبار لغت درست ہی ہو۔ سرمایہ کا پیش لفظ۔ صفحہ (۹) میں

ان حوالوں کے بعد مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث بھی پیش کردوں اس کے بعد اپنے معروضات کو بیان کروں گا۔

''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف حاصل کرتا تھا وہ بیمار ہوگیا۔ نبی ﷺ عیادت کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ نے لڑکے کے سرہانے اس کے باپ کو توراۃ پڑھتے ہوئے دیکھ کر اس سے فرمایا۔ اے یہودی میں تجھکو اس خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ پر توراۃ نازل فرمائی کہ کیا توراۃ میں میری نعت میری صفت اور میرے مخرج (بعثت، ہجرت اور مدفن) کا تذکرہ پاتا ہے اس نے جواباً انکار کیا تو لڑکا بول اُٹھا خدا کی قسم میں توراۃ میں آپ کی نعت آپ کی صفت اور آپ کی مخرج کا تذکرہ پاتا ہوں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور بلاشبہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ (بحوالہ مشکوٰۃ شریف)

ان حوالہ جات کی روشنی میں اب چند باتیں پیش کرتا ہوں۔

عربی فارسی شاعری میں کیا اوائل اور ابتدا کے زمانے کے بعد ہی صورت حال یہی رہی یا کوئی اختصاص کا پہلو بھی اُبھرا یہ باتیں مزید تحقیق کی متقاضی ہیں ممکن ہے اگر عموم کا یہی رجحان غالب رہا تو عربی وفارسی شاعری میں اصناف کا تعین حمد باری، نعت پاک، منقبت ہے یا نہیں اگر یہی سلسلہ

رہاتو پھر اسے کس سرنامے سے منسوب کیا گیا ؟

اردو زبان وادب میں اصناف حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، قصیدہ، غزل مثنوی وغیرہ کی دریافت کب ہوئی؟ اگر فارسی اصناف کی پیروی میں کی گئی تو فارسی میں ان اصناف کا سلسلہ کب سے ہے اور پھر کیا عربی شاعری میں جو قصائد، مدحیہ، مرثیہ قدیم اصناف مانے جاتے ہیں ان کی اپنی اختراعی اصناف ہیں۔ یا عربی میں بھی کسی دوسری زبان سے آئی ہیں۔ یہ چند ایسی باتیں ہیں جو ہزاروں سال کے دفتر کو کھنگالنے کے بعد بھی نام بنام بتانا مشکل ہے ، ہم سب جانتے ہیں عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں اصناف منتقل ہوئی ہیں مگر ہر زبان کا اپنا انفرادی مزاج اور ماحول جداگانہ رہا ہے۔ ہر زمانے میں اصناف کے ضابطے اور تقاضے اس زبان کے مزاج کے مطابق ڈھلتے چلے گئے۔ قصیدہ ایک توانا صنف ہے عربی میں اپنا رنگ و آہنگ اور ضابطہ کچھ اور ہے فارسی والوں نے اس میں کچھ اور رنگ پیدا کئے اور یہی قصیدہ اردو میں اپنا مخصوص اسلوب رکھتا ہے۔ زبان الگ۔ مزاج الگ، معمولی ہیئت کی پیروی اور علاقائی اثرات الگ۔ اب ہماری یہ باتیں لاعلمی کی سرحد کو چھو جائیں گی جب ہم کہیں گے کہ اردو قصیدہ فارسی قصیدہ کا ہم رنگ و آہنگ کیوں نہیں اور فارسی قصیدہ عربی قصائد کے مزاج و رنگ اسلوب اور فنی تقاضوں کا پابند کیوں نہیں لامحالہ آپ کہیں گے کہ ہر زبان کے کچھ مختلف تقاضے اور ضابطے ہوتے ہیں اس کی پیروی ضروری ہے۔ جس زبان میں جس صنف کو برتا جاتا ہے فطری اعتبار سے ان زبانوں کا مزاج اور ماحول غالب آجاتا ہے آپ نے ہائکو، سن رائی یو اور ترائیلے وغیرہ کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ کیا یہ اصناف جو مغربی اصناف ہیں جاپانی زبان سے ہماری زبان میں داخل ہوئی ہیں بالکل جاپانی اصناف کی اصل صورت میں برقرار ہیں یا ان پر اردو مزاج کا رنگ چڑھ گیا ہے۔۔۔ بس یہی ہمارے مسئلے کا حل ہے۔

یہ امر تعجب خیز ہے کہ لفظِ نعت کو ہم اپنی خود ساختہ تنقید اور تحقیق کی خار دار وادیوں سے گزاریں کیوں کہ اس نے صدیوں کا سفر ایک معنوی اور مخصوص موضوعی وجود کے ساتھ طے کر چکا ہے دنیا کی تین مشہور زبانوں اور کئی معروف ملکوں کی سرحدوں کا سفر طے کرنے بعد اسے ایک ایسی منزل نصیب ہوئی ہے کہ تحقیق سے ماورا ہو چکی ہے مگر یہ وقت کا عجیب سانحہ کہئے کہ اردو دنیا کے بعض آزاد خیال قلم

کاروں کی طرف سے ایک شوشہ چھوڑا گیا کہ لفظِ نعت نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی بھی شخصیت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اصل صورتِ حال کیا ہے اس کی طرف مدیر الکوثر مولانا ملک المظفر نے یوں نشاندہی فرمائی ہے۔

''اہلِ فن نے لفظِ نعت کو نبی کریم ﷺ کی تعریف وتوصیف کے لئے ہی مختص کر دیا ہے لیکن اب اس اختصاص پر بعض ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے انگشت نمائی کی جا رہی ہے چنانچہ سالِ گذشتہ ادبی دنیا کے ایک مخصوص خیمے سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ لفظِ نعت نبی کونین ﷺ کی مدح وثنا کے علاوہ کسی اور کی تعریف وتوصیف کے لئے استعمال ہو سکتا ہے چناچہ صلاح الدین پرویز صاحب نے ایک نظم کرشن کی تعریف وتوصیف میں لکھی اور اسے نعت کا عنوان دے دیا۔ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر جیلانی کامران نے ماہنامہ 'علامت' ۲۰۰۰ء کے زاویئے میں صلاح الدین پرویز کی اس نظم کو نہ صرف یہ کہ خوب سراہا بلکہ اسے نعت کہنے کی پرزور وکالت کر گئے،،

کسی لفظ کو اصطلاح بننے میں ایک طویل زمانہ درکار ہوتا ہے پھر قبولِ عام ملتا ہے اور پھر وہی لفظ علامت کی شکل اختیار کر کے ادب کا حصّہ بن جاتا ہے کسی لفظ میں معنوی تغیر کا پیدا ہونا عام بات ہے لیکن اصطلاح میں معنوی اختلاف کا پیدا ہونا کوئی عام بات نہیں ہمارے یہاں کچھ لوگ راتوں رات شہرت پسندی کے ہوس میں کچھ ایسے ہی شگوفے چھوڑتے ہیں کہ ان کا نام کسی طرح زبان زد ہو جائے۔ یہ عام ادبی دنیا کی صورتِ حال ہے، سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسی مغربی ذہنیت رکھنے والے فکشن نگار کا یہی حربہ ہے تاکہ اس کے ذریعے گمراہیت کو عام کیا جائے اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مداحانِ رسول کو ان کی کالی ذہنیت سے محفوظ رکھے۔ سینکڑوں اردو کے غیر مسلم شعراٗ بھی نبی اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف نعت ہی کے عنوان کے تحت کرتے رہے اگر کسی مسلم شاعر نے کرشن، رام، لچھمن وغیرہ کی تعریف میں قومی یکجہتی کے تصور کے تحت اگر کچھ لکھا بھی ہے تو اسے نعت کا سرنامہ کہنا گوارہ نہ کیا، قصیدہ ایک عام صنف کی حیثیت سے متعارف ہے بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں یا کسی بھی بڑی شخصیت کی مدح میں نظر آجاتا ہے مگر صنفِ نعت صرف اور صرف نبی دوجہاں کی تعریف وتوصیف ہی کے حوالے سے صدیوں کا سفر کرتی رہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اردو نعت پر بھجن کے اثرات

اردو نعت کے حوالے سے ناقدین و محققین جب ہندوستانی فضا، طرزِ معاشرت، تہذیب وتمدن اور ہندومت کے اثرات پر گفتگو کرتے ہیں تو مضامینِ نعت کے ساتھ نعت کے فن پران امور کی طرف نشاندہی ضرور کرتے ہیں جہاں ہندی زبان کے الفاظ بھجنوں کے تلامذات، مناسبات اور متعلقات، رموز والائم، استعارات وتشبیہات کے علاوہ ہیئتی مسائل میں گیت، راگ وغیرہ کا ذکر آتا ہے جس کی ایک طویل بحث ہے مثلاً ہندوستان کی کلاسیکی موسیقیت میں ٹھیٹھ، دادرے، کھمانچ قوالی ٹھمری وغیرہ کی مثالیں عام ہیں۔ کہیں نعت میں ہندی بھجنوں کی طرح گوپیوں کے کرشن مہاراج سے محبت کا انداز نظر آنے لگا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ نعت میں عورتوں کے جذبات اور نسائی عقیدت مندی کا اظہار بھی ہوا، کچھ مثالیں ملاحظہ کریں،

موراشام کنہیا مدینہ بسو موہے مرلی کی لے نہ سنائی کیوں
میں تو آج دوارے کا ڈھونڈ پھری گئی دیس بدیس مگر نہ ملا
کوئی ایسی سکھی چاتر نہ ملی مجھے پی کے دوارے بٹھا دیتی
میں نے راہِ مدینہ بھی دیکھی نہیں مجھے بیاں پکڑ کے بتا دیتی
جگ جوتی سوامی اوتاری تیرے روپ کے واری سیّدنا
من موہن گردھر گردھاری تیرے روپ کے واری سیّدنا

کہت ہے سب جگ جسے محمد — اسی نے نینا لگا کے مارا
تورے ہجر میں حق کے پیارے نبی — مورا چین گیا موری نیند گئی
مورے من میں ہے اب تو جوگنیاں بنوں — اور مَل کے بھبھوت مدینہ چلوں
میں شبدوں کی باسی میں چرنوں کی داسی — تری جستجو مجھ کو صبح ومسا ہے
میں جوگن بروگن میں کملی کمینی — تو سرتاج میرا مرا دیوتا ہے

محسن کاکوروی کا قصیدۂ لامیہ ”سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل،، ہندوستانی نعتیہ قصیدے کا

ایک منفرد المثال قصیدہ ہے اس قصیدے کی پوری فرہنگ پر مقامی عناصر غالب ہیں مثلاً کاشی، متھرا، گنگا جل، اشنان، گوکل، جمنا، مہابن، تیرتھ، برہمن، شری کرشن، درشن، گوپیوں، راکھیاں، مندر، کنہیا، ہنڈولے کا میلہ، جوگی، بروگی، راجہ اندر وغیرہ جیسے کتنے الفاظ ہیں جسے نعت میں سمونے کی کوشش کی گئی ان کے بعد بہت سے شعرائے اندھی تقلید شروع کردی جن میں بیشتر شرعی حدود وقیود کی پاسداری نہ رکھ سکے عصرِ حاضر میں بیکل اتساہی، عبدالعزیز خالد، امجد حیدرآبادی کی نعتوں میں ہندی الفاظ، تلازمات، مناسبات، تصورات وغیرہ نظر آتے ہیں کہیں محتاط رویہ ہے کہیں غیر محتاط طرزِ اظہار

اردو شعراء پر ایک زمانے سے اعتراض ہوتا رہا ہے کہ اردو شعرائے ہندوستان میں بیٹھ کر عرب وایران کے گن گائے ہیں اور اپنے ادب میں ہندی اور ہندوستانیت کو کوئی جگہ نہ دی اس اعتراض کا جواب امیر خسرو سے میر تقی میر تک غالب سے انیس ودبیر تک نظیر اکبرآبادی سے اقبال وحالی تک اور موجودہ عہد کے نمائندہ شعراء تک باآسانی ان کے کلام سے دلائل وشواہد پیش کئے جاسکتے ہیں اردو زبان میں مشترکہ کلچر اور ہندوستانیت کے مسائل روشن آئینے کی طرح ہیں اردو نعت کے حوالے سے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ایسا قرینہ نہ اپنایا جائے جو نعتیہ فضا کو بھجن میں تبدیل کردے ہندی لفظوں کا استعمال اردو نعت میں ممنوع نہیں صرف ان مناسبات، تلازمات ومتعلقات سے پرہیز کرنا لازم ہے جو ایمانیات واعتقادیات سے متصادم نہ ہوں اور کفر واسلام کا فرق واضح ہو ہندی اثرات کے تحت بعض نعت نگاروں سے یہ بے احتیاطی بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے بھجنوں اور گیتوں کے زیر اثر حضور ﷺ کے لئے پرماتما، سرتاج، دیوتا، مہاراج، پربھو، سوامی، گرودیو جیسے الفاظ استعمال کئے بلکہ کرشن کی ذات سے متعلقہ تلازمات کو حضور ﷺ کی جانب منسوب کردیا ظاہر ہے اس طرح کی یہ ان کی کاوش حبطِ ایمان کا سبب بن گئی۔

امام احمد رضا فاضلِ بریلوی کی مشہورِ زمانہ نعت "لم یات نظیرک فی نظر" سے ہماری رہنمائی ہوتی ہے جہاں عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت کے الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور کوئی بھی لفظ حدودِ شرع سے تجاوز کرتا نظر نہیں آتا جس سے صاف ظاہر ہے کہ نعت میں لفظوں کا استعمال بہت ہی سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے ☆☆☆

اسلام سے شعروادب کی وابستگی

اسلام بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس میں انسانیت کی تمام مادّی اور روحانی تسکین و آسودگی کے وسائل موجود ہیں۔ اسلام کے آفاقی نظام کی یہ خصوصیت ہے کہ انسان کی فطری و جبلّی صلاحیتوں کو فراموش نہیں کرتا ہے۔ بلکہ ایک انقلاب آفریں ترتیب و تزئین سے اس طرح ہمکنار کر دیتا ہے کہ اس کی حقیقت میں تہہ در تہہ معنویت کا ایک جہان سمٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس فطرت کی آسودگی کے لئے جو لوگ بے سروپا طریقوں اور ضابطوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ نہ صرف نا آسودگی میں سرگرداں ہو جاتے ہیں بلکہ اس حقیقت کے حقیقی عرفان سے محروم ہو جاتے ہیں اور انسانی تہذیب و تمدن پر اس کے بدترین اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں بعض لوگوں میں فنون لطیفہ سے دلچسپی فطری طور پر پائی جاتی ہے یہ ایک عظیم نعمت ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے مختلف لوگوں کو ودیعت فرمایا ہے لیکن یہ تاریخ انسانیت کا عجیب و غریب سانحہ ہے کہ جب صحرائے عرب میں اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو جہاں تمام باطل پرست اس زمانے کے بہترین اسلحوں سے لیس میدان میں اُتر پڑے ان میں ایک نہایت مؤثر آلۂ کار شعرو ادب کو بھی دیکھا گیا کیونکہ عرب فنون لطیفہ کے بے حد پرستار تھے ان کے قبائلی سماج میں جب کوئی نیا شاعر وجود میں آتا تو دور دراز سے مختلف قبائل اسے مبارکباد پیش کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ ان کی اس محفل میں عورتیں بھی شریک ہو کر نغمہ سرائی اور دف نوازی میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ عرب کا یہ عام رجحان تھا شاعر کی جادو بیانی اور آتش نوائی ان کے جذبات و احساسات کو بیدار کرتے تھے اس طرح ہر شاعر اپنے قبیلے میں بے تاج بادشاہ ہوتا تھا جب وہ کسی سے خوش ہو جاتا تو ایسی مدح سرائی کرتا کہ پورے عرب میں اس کی نیک نامی کا شہرہ ہو جاتا تھا یعنی جھوٹی مدح سرائی اس درجہ کرتے کہ شیطان بھی فرشتہ نما ہو جاتا تھا لیکن اگر بدنصیبی سے کسی فرد یا قبیلہ سے ناراض ہو جاتا تو ان کی ہجو میں وہ کمالِ سخن دکھاتا کہ زندگی گزارنا بھی مشکل پڑ جاتی تھی یہی صورتِ حال داعیانِ اسلام

کے ساتھ پیش آئی چونکہ اسلام بیجا روائیوں کا مخالف تھا۔لہذا زمانہ جاہلیت کے وہ نمائندہ شعرا جو اپنی سابقہ روایات اور مذہبی تعصبات وعقائد کی پاسداری میں اسلام کے زبردست مخالف ہوئے ان میں ابوسفیان بن حارث عبداللہ زبعری۔ضرار بن خطاب اور ابوعزۃ عظمی وغیرہ سامنے آئے ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ اور انصار ومہاجرین کی زبردست ہجو کی اور طرح طرح کے غلط الزامات و بہتان باندھکر اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔کعب بن اشرف کی دریدہ دہنی کا یہ عالم تھا کہ امہات المومنین اور دیگر مقدس صحابیات کا ذکر بطور تشبیب کیا کرتا تھا لیکن جب اس کی گستاخیاں حد سے گزر گئیں تو ایک صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔اسلام کی مخالفت میں نہ صرف مشرکین عرب تھے بلکہ یہودی شعرا بھی پیش پیش دیکھے جانے لگے جب یہودی شعرا اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آئے تو حالات کے پیش نظر انہیں شہر بدر کرنا پڑا تھا ایسے نازک حالات کے پیش نظر حضور سید کائنات ﷺ نے اعلاء کلمۃ الحق کی نشرواشاعت اور کفار ومشرکین شعرا کے باطل نظریات والزامات کی جواب دہی کے لئے شعرا اسلام کو حکم فرمایا اور ان کی بے پناہ حوصلہ افزائی فرمائی اس سلسلے میں چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حسان بن ثابت کے لئے مسجد نبوی میں ممبر بچھواتے تھے جس پر حسان کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی کرتے اور کفار ومشرکین کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے اور نبی دوجہاں ﷺ ارشاد فرماتے اللہ تبارک و تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حسان کی مدد فرماتا ہے جب تک وہ اللہ کے رسول کی طرف سے مواقفت یا مفاجرت کرتے ہیں۔

(۲) اسی طرح یہ حدیث پاک اجب عنی اللھم ایدہٗ بروح القدس یعنی جواب دے میری طرف سے (اے حسان) یا اللہ مدد کر حسان کی جبرئیل کے ذریعہ۔

(۳) اسلام نے شاعری کو اعلاء کلمۃ الحق اور تبلیغ کا ذریعہ بنایا مجاہدین اسلام کی شان ہوا کرتی تھی کہ وہ تلوار اور زبان دونوں سے دین اسلام کی مدافعت فرماتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے۔

عن كعب بن مالك انهٗ قال النبی ﷺ ان الله قال انزل فی الشعر ماالنزه قال النبي ﷺان المو٫منین مجاهد سیفه ولسانه والذی نفسی بیده به یصح النیل (مشکوٰۃ)

(۴) حضور پرنور ﷺ کی بارگاہ رحمت پناہ میں اکثر مشرکین اپنے قبیلے کے بڑے شعرأ کے ہمراہ مبارزت طلبی کے لئے آیا کرتے تھے اور یہ گمان بھی ساتھ لاتے کہ محمد ﷺ معاذ اللہ ایک شاعر ہیں جو عربی شعر و ادب پر کامل قدرت و اختیار رکھتے ہیں ان کا یہ بھی خیال تھا کے قرآن کوئی آسمانی کتاب نہیں بلکہ مجموعۂ شاعری ہے لہذا اس باطل خیال ونظریہ کے سد باب کے لئے ارشاد ہوا " وماعلمنه الشعر مایبنغی له " یعنی ہم نے اپنے پیغمبر ﷺ کو شاعری کے ساتھ مبعوث نہیں کیا اور وہ ان کے شایان شان نہیں تھا۔ اس موقع پر نبی رحمت ﷺ مسلم شعرأ کو ان سے مبارزت طلبی کا حکم فرماتے اور وہ قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو جاتا تھا۔

(۵) رسول پاک ﷺ کے دور گرامی میں جب کہ حریف طاقتوں نے سخت معرکے بر پا کئے تو ایسی صورت میں شعر و سخن کے ذریعہ بھی جہاد اور جنگ ناگزیر تھی ایک قبیلہ کا وفد مبارزت طلبی کے لئے آیا تو ثابت بن قیس نے ان کے خطیب عطارد کا اور حسان بن ثابت نے ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا جواب دیا آخر میں وفد کے ایک رکن اقرع بن حابس نے کہا میرے باپ کی قسم ہے یہ شخص (رسول اللہ ﷺ) باتوفیق ہے ان کا خطیب ہمارے خطیب سے بڑا اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بڑا ہے۔

(۶) فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں بنی ہوازن اور بنی ثقیف وغیرہ اور آس پاس کے چند قبائلی گروہ ایک ساتھ ہو کر اس کوشش میں تھے کہ مسلمانوں پر ان کی بے خبری کی حالت میں ان پر حملہ کر دیا جائے لیکن جب اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپ نے ایک بڑی جماعت لیکر ان کی طرف پیش قدمی فرمایا۔ ایک طرف مسلمانوں کو اہل ہوازن کی تیراندازی کا خوف تھا تو دوسری طرف اہل ہوازن کو عبدالمطلب کے خواب کی تعبیر نے ہراساں کر دیا تھا جب میدان کارزار گرم ہوا تو

مسلمان ان کی تیر اندازی کے سبب بکھر نے لگے اسی اثناء میں مجاہدین اسلام کے دلوں میں جوش اسلامی بیدار کرنے کے لئے حضور سید کائنات ﷺ نے شعر کے انداز میں یوں فرمایا۔ انا النبی لاکذب انا بن عبد المطلب (میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں، فرزند عبدالمطلب ہوں اس میں بھی کوئی کلام نہیں) نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے جہاں مسلمانوں کو جوش شجاعت ملی وہیں کفار ومشرکین کا کلیجہ دہل گیا اور مسلمانوں کی شاندار فتح ہوئی۔ مذکورہ بیانات اور روایات کے پیش نظر یہ بات روز روشن کی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ مذہب اسلام نے شعر وادب کی بے مثال خدمت انجام دی ہے اس کے برعکس دیگر مذاہب نے شعر وادب کے ذریعہ اپنی تعلیمات ونظریات کو عام کر نے کا ایک وسیلہ ضرور بنایا مگر کوئی صاحبِ بصیرت اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا ہے کہ مذہب اسلام نے ادباء اور شعراَ کی براہِ راست فکری، علمی وعملی تربیت بھی فرمائی اسی طرح اسلام پسند شعراَ جن کی تربیت بالواسطہ یا بلاواسطہ دربار نبوت سے ہوئی انھوں نے نہ صرف مذہبی نظریات وعقائد کو کمال سخنوری سے پیش کیا۔ بلکہ ان تمام ادبی وفنی قدروں کو نئی تہذیب اور نئے شعور کی روشنی میں لاکر جہاں ماضی کی صحت مند ادبی روایت کے جسم میں نئی زندگی کی کرن دوڑادی وہیں زمانہ حال کی نزاکتوں اور مطالبوں کا حق ادا کیا جن کے نتیجے میں مستقبل کے لئے ایک مضبوط صالح ادب کی باضابطہ روایت قائم ہوئی۔ اگر ان باتوں کو ہم تاریخ اسلام اور تاریخ عرب کے حوالے سے دیکھیں تو بہر صورت ہماری نظر اس مقام پر مرکوز ہو کر رہ جائیگی جہاں اسلام سے قبل دورِ جاہلیت کے شعر وادب کا بیشتر حصہ ایک مخصوص اور محدود دائرہ میں گردش کرتا نظر آئے گا۔ ان کے خاص اسالیب بیان اور موضوعات اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کریں گے بقول علامہ شمس بریلوی

''قدیم شاعری میں دو تین موضوع خاص اہمیت رکھتے تھے، یعنی مدح اور رثا اور ہجو ''مدحت طرازی مرثیہ نگاری اور مذمت'' عربی ادب کی تاریخ کے اس پہلو کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعض شعراَ جاہلیت کے یہاں اخلاقیات یا اخلاقی مضامین بھی موجود ہیں لیکن وہ کوئی جداگانہ صنف سخن نہیں تھی بلکہ رثا یا مدح کی تشابیب میں وہ بعض اخلاقی مضامین کو پیش کر دیا کرتے

تھے۔ان کے اخلاقی موضوعات وہی تھے۔ جوایک بدوی زندگی کے مسلمہ اصول تھے۔یعنی سخاوت دیانت امانت چنانچہ ان موضوعات کے تحت آپ کو شعرائے جاہلیت کے اشعار مختلف اسالیب میں ملیں گے لیکن ایسے اخلاقی مضامین بہت کم ہیں ان کے شاعری کے موضوعات میں مدح (جس کی بنیاد غلو پر ہے) اور قدح (ہجو) خاص طور پر شامل ہیں تیسری صنف سخن مرثیہ ''رثا'' ہے۔جس طرح مدح میں وہ ممدوح کے اوصاف کو مبالغہ کی آخری حد تک پہنچا دیتے تھے۔اسی طرح مرثیہ میں بھی مر نے والے کے اوصاف کو ان بلندیوں تک پہنچا دیا جاتا تھا جہاں تک فکر انسانی کی رسائی کا امکان ہے۔قدح میں وہ اس سے بھی آگے نکل جاتے تھے مدح اور قدح سے قطع نظر کر لیجئے تو پھر ان کے یہاں شراب ونغمہ ہے اور عورت! عورت سے عشق ومحبت کا اظہار عموماً اپنی بنت عم سے کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں وہ آخری حد تک پہنچ جاتے تھے عورت کے بعد ان کے یہاں شراب کا ذکر بھی اسی کثرت اور تنوع کے ساتھ ملے گا۔

دورِ جاہلیت کے ان ادبی رویوں کے مقابل اسلام کا روحانی فکری شعوری تہذیبی اور اخلاقی انقلاب آیا اور قرآن کریم میں ان کے تمام ادب پاروں کو ایک مخصوص معنوی وفطری جہت عطا کی تو عرب شعروادب کو ایک ہمہ گیر موضوع اور آفاقی مزاج ونظریہ حیات کی دولت مل گئی۔اب شعروادب سے مبالغہ آمیز قصائد ،فحش کلامی، بے بنیاد ہجو، بے سروپا خیال آرائیاں، ذاتی ونسلی عصبیت،قبیلہ پرستی اور بدوی زندگی کے نقوش مٹ گئے۔اسلام کے فیضان سے ایک قیامت خیز تبدیلی پیدا ہوئی جس میں انسانیت نوازی وحدانیت ورسالت کا صداقت مآب شعور،تہذیب وتمدن کا آفاقی نظام،عبادت وریاضت کا انوکھا مزاج اور بین الاقوامی نظام حیات کا لازوال اسلوب حیات پوری کائناتِ فکروادب کو اپنی جلو میں پروان چڑھانے لگا۔دور نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانے میں عرب شاعری کا یہ انوکھا مزاج تشکیل پایا جس میں دعوت اسلام کی نشرواشاعت اور اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر ملتا ہے لیکن خلافت راشدہ کے بعد عرب کی سوئی ہوئی قوتیں دوبارہ بیدار ہوگئیں اور ان کی تشابیب میں عہدِ جاہلیت جیسا ذکر ہونے لگا ان کے علاوہ عرب شاعری کا سب

سے انوکھا اموی اور عباسی دور کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں اسلام کا فطری رنگ پوری تخلیقی قوتوں کے ساتھ سامنے آیا۔ جو اسلامی شعروادب کا بہترین ترجمان ہے تقریباً بیشتر نقاداس بات پر متفق ہیں کہ شعروادب پر عصری انقلاب کے اثرات بہر طور مرتب ہوتے ہیں اور یہی وہ امر ہے جس کے تحت مختلف ادوار کے ادبی منظر ناموں کے خدوخال سے واقفیت ہوتی ہے اگر اس نظریئے کے تحت زمانۂ جاہلیت اور عہد نبوت کے شعروادب کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کریں تو ہمیں اوپر بیان کئے گئے معروضات سے نہ صرف ادبی مقامات کا پتہ چلے گا۔ بلکہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور ملی حالات کا بھرپور علم ہو جائے گا۔ جس طرح تاریخ عربی ادب کے حوالے سے مذکورہ حالات وکوائف ہوئے اور اسلام کا فیضان ہماری نگاہوں سے جلوہ بار ہوا ٹھیک اسی نہج پر جب ایران وہند میں اسلامی انقلاب کا غلغلہ بلند ہوا تو یہاں بھی ادبی افق پر جلوۂ اسلامی قوس قزح بن کر فکری وشعوری حیات کا پیش خیمہ بن گیا آج فارسی شعروادب جو اسلامی فیضان سے قبل اپنا نمایاں وجود تک قائم نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اسلام کی برکتوں سے اس قدر خود کو فیضان بار کرلیا ہے کہ اخلاقیات وتصوف کا ہمہ گیر موضوع فارسی ادب کے حوالے سے دنیا کے ترقی یافتہ ادب کو فکرونظر کا چراغ تقسیم کرنے لگا۔ اسی طرح اردو ادب جو ابتداء ہی سے عربی وفارسی ادب کی آغوش میں پروان چڑھا، اس کا قدیم وجدید رنگ وآہنگ ہر ایک مقام پر اسلام سے وابستگی کا اظہار واقرار کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

جدید اردو شاعری میں
مذہب کا استحصال

عصر حاضر میں جدید انسان ضرورت سے زیادہ خود پرستی کا شکار ہو گیا ہے وہ خود کو کسی مخصوص
نظریے کا کا پابند رکھنا رجعت پسندی اور قدامت پرستی تصور کرنے لگا ہے پرانی قدروں کے صالح
نظریات وتصورات جو نہ صرف اعلیٰ ادب کے لئے بلکہ انسانی زندگی کے بہترین نمونے ہیں ان سے
بھی غیر سنجیدہ رویہ رکھتا ہے اور اب اس کوشش میں مصروف ہے کہ تمام پرانی قدروں کو عجائب خانوں
میں بند کر دیا جائے اس لئے کہ جدید انسان پرانی روایتوں میں وہ عافیت محسوس نہیں کرتا جو اس کی اپنی
تاریخ بتاتی ہے حتیٰ کہ اس تجاہل کے پاداش میں اسے جہالت و گمراہی کے عمیق سمندر ہی میں کیوں نہ
ڈوب جانا پڑے دراصل جدید انسان تغیر و تبدل اور نئے رجحانات کی پیروی ضرورت سے زیادہ اسی
لئے کر رہا ہے کہ اس کے پاس صالح اور روحانی قدروں کے صالح تصورات ونظریات کا کوئی خزانہ
نہیں ہے جس سے نئی ہوا کا رخ پہچان سکے دنیائے انسانیت میں یہ انقلاب عموماً دو طرح سے آتے
ہیں ایک انفرادیت پسندی کے تحت اور دوسری اجتماعی تحریک کی صورت میں اگر انفرادیت واجتماعیت
میں صالح ادب کا نظریاتی تصور کار فرما ہے تو وہ رفتہ رفتہ انسانی تہذیب پر اپنی افاقیت مسلط کر دیگا اور
صالح تصورات ونظریات سے انسانی تہذیب میں ایک بامعیار فضاء قائم ہوگی اگر اس کے برعکس
ضلالت و جہالت جو زندگی کے لئے ایک افیون ہے اپنی توانائی سے اثر انداز ہوئی تو زندگی وقت سے
پہلے فنا کے گھاٹ اتر جائے گی اسی طرح کائنات شعر وادب میں بھی بے شمار نظریاتی انقلاب آئے
جس کا عکس شاعری پر خصوصاً دیکھا جاتا ہے مگر اردو شاعری کا عجیب المیہ ہے کہ اردو شعرا اور ناقدین کچھ
زیادہ ہی سنجیدہ ثابت ہوئے ولی دکنی سے میر تک غالب سے اقبال تک فیض سے راشد تک اور
موجودہ جدید ادب تک ایک عجیب کشمکش کا عالم رہا۔ حالی اردو کے پہلے ناقد کہلائے جنھوں نے فرسودہ
شعری روایات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے نئی شاعری کی بنیاد رکھی اور پیروئ مغرب

کی تلقین کی شبلی نے مشرقی ادب کے بامعیار ادب کا خاکہ پیش کرتے ہوئے نئے اقدار کی طرف آواز دی اور اسی عہد میں اقبال جیسا عظیم مفکر آیا جس نے اردو ادب کو عالمی ادب کے تصورات سے روشناس کیا مگر موجودہ ادب کا کوئی صالح تصور اب تک کھل کر سامنے نہ آسکا۔

میں نے جس مسئلے کو چھیڑا ہے وہ غیروں کے لئے کم اور اپنوں کے لئے زیادہ توجہ کا طالب ہے۔اس مسئلے کا منظر و پس منظر میری نگاہوں میں کئی زاویوں سے ابھر رہا ہے مثلاً یہ کہ جدید شاعری میں مذہب بیزاری کے رجحانات کیوں شدت کے ساتھ پیدا ہوئے اس کے اسباب وعلل کیا ہیں۔دوم یہ کہ کیا کوئی مذہب شاعری ہوسکتا ہے یا کوئی شاعری مذہب ہوسکتی ہے۔سوم یہ کہ آخر کیوں مذہب شاعری کے جملہ مسائل کو قبول نہیں کرتا ہے۔چہارم یہ کہ مذہب سے شاعری کا اجتناب کیسا ہے؟

پہلے سوالوں کا یہ مختصر جواب ہے کہ ہندستان میں اردو زبان کی پیدائش کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی سازش کے تحت تمام مذاہب کے چہرے جو ہندستان میں اپنی شناخت رکھتے ہیں کہ اپنے مفادات کے لئے مسخ کردیئے جائیں اور مغرب پرست قوتوں کو ان کے حقیقی نظریات وافکار پر مسلط کردیا جائے تاکہ مذہبی لوگ دین کا حقیقی شعور نہ پاسکیں۔چنانچہ ہزاروں سال پرانی قدروں کے صالح تصورات ونظریات کو پامال کیا جانے لگا۔آج اسی کا ردعمل جدید شاعری میں خصوصاً دیکھا جارہا ہے اسی کے ساتھ اشتراکی نظریوں نے بھی مذہب مخالف رجحانات پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کئے۔

دوسرے سوال کے ضمن میں کوئی فیصلہ کن بات کہنا مشکل ہے کیوں کہ مذہب انسانی زندگی کا ایک لائحہ عمل ہے اور شاعری انسان کے قلبی واردات کیفیات کا اظہار ہے تو اس عالم میں مذہب کا شاعری ہونا امر محال ہی ٹھہرتا ہے مگر بعض اوقات شاعری مذہب کے نام سے ضرور موسوم ہوجاتی ہے جیسا کہ ہندستان کے قدیم مذہبی شعری سرمائے میں 'وید' 'پران' 'رمائن' 'بھارت' وغیرہ ہیں۔اسی کے ساتھ مذہب کے اثرات تو شعروادب پر ہمیشہ دیکھے جارہے ہیں۔

تیسرا اور چوتھا سوال کچھ اس طرح ہے کہ شاعری مذہب کے مسائل اور مذہب شاعری کے مسائل قبول کیوں نہیں کرتا ہے۔تو میرے خیال میں شاعری اپنی تمام تر فکری آزادروی کے

تحت مذہب کی حدود شناسی کا بوجھ اٹھانے سے قاصر رہتی ہے اور مذہب شاعری کے بے سروپا خیالات وافکاراور گمراہ کن نظریات کو قبول نہیں کرتا ہے۔

اب آخر میں ایک سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ مذہب سے شاعری کا اجتناب تو ہر زمانے میں رہا ہے۔ بعض نے سرے سے کوئی مذہبی تصور کو برتا ہی نہیں اور کچھ لوگوں نے اپنے طور پر شاعری میں مذہب کو سمویا لیکن محض مذہبی لوگوں کے کردار واطوار کا احاطہ ہی سامنے آیا۔ان میں مذہب کا حقیقی عرفان سطحی پیرائے میں ہوا (اس ضمن میں صوفیائے کرام اور دیگر مذہبی شعرا کی شاعری بالکل مختلف ہے جس پر توجہ کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے) مگر آج تو مذہب اور اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف شاعری کو استعمال کیا جارہا ہے۔

اسلام شاعری کا مخالف نہیں مگر شاعری کے بیجا تصورات وافکار کو قبول بھی نہیں کرتا کہ جس سے صالح ادب کا خون ہوتا ہو اسی لئے زمانۂ جاہلیت کے ترجمان شعراٗ جو عرب سماج میں ایک اہم مقام رکھتے تھے ان کے جاہلی رویئے سے اجتناب کیا اور عرب شاعری کو گمراہی و جاہلیت کے سمندر سے نکال کر صحت مند آب وہوا میں لے آیا مگر اسلام کی مخالفت میں بعض عرب شعراٗ اپنی سابقہ روایت کی پاسداری ہی کرتے رہے حتیٰ کہ رسول پاک ﷺ کی ہجو بھی کرنے لگے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہوا۔

والشعرا ء یتبعھم الغاون الم ترانھم فی کل وادیھیون وانھم یقولون مالا یفعلون

(اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں ۔کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہروادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں وہ نہیں کرتے)

اسلام نے جہاں شاعروں کی مذمت کی وہیں اس کی شاعرانہ خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ان من البیان سحرا

ان من الشعر االحکمة

بعض بیان جادو ہوتا ہے اور بعض شعر سراسر حکمت۔

اسی کے ساتھ دربارِ رسالت مآب ﷺ میں بے شمار قادر الکلام شعرا بھی نظر آئے جن میں حضرت حسان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن ذہیر اور دیگر صحابی شعرأ کو خاص مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی۔ انہوں نے زمانۂ جاہلیت کے شعری رویوں کے گمراہ کن نظریات کا جہاں سد باب کیا وہیں اسلامی نظرئے کے تحت عرب شاعری کو انوکھا شعور، آفاقی مزاج اور پاکیزہ اظہار بھی بخشا جسے دنیائے شعروادب کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔

اردو شاعری میں ایک زمانے سے مذہب بیزاری کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے کچھ لوگ مذہب کو افیون اور رجعت پسند قوت سمجھ کر حرف ملامت بتا رہے ہیں اور کچھ لوگ فیشن کے طور پر رکیک قسم کے حملے کر رہے ہیں ان میں بعض ایسے بھی لوگ ہیں جو دراصل مذہبی کہلاتے ہیں مگر ان میں مذہب کا حقیقی شعور نہ ہونے کے سبب گمراہی نے انہیں دبوچ رکھا ہے۔

اردو شاعری میں یہ تخریبی رجحان ۱۹۳۵ء میں اور بھی شدید ہوگیا۔ جسے ترقی پسند تحریک نے پوری اجتماعی قوت کے ساتھ بڑھاوا دیا اور اشتراکی نظریوں کو ادب پر مسلط کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اسی کے زیر اثر ۱۹۶۰ء کے بعد ہونے والی جدید شاعری میں مغرب پسندی کی لادینیت، ملحد افکار و خیالات، وجود خدا کا انکار، آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کی تحقیر اور مذہب کے بنیادی عقائد کے خلاف طرح طرح کے باطل الزامات اور فحش گوئی کے نمونے پیش کئے گئے۔ ذیل میں چند ترقی پسند شعراء اور جدید شعراء کے اشعار پیش کرتا ہوں۔

عقائد وہم ہیں مذہب خیال خام ہے ساقی
ازل سے نوع انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

(ساحر)

اب رسولوں کی کتابیں طاق پر رکھ دو فراز
نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون

(احمد فراز)

آدمی کے ہاتھوں میں دیکھ کر سر جبرئیل

رات روبرو میرے رو دیا خدا چپ چاپ

(کیفی اعظمی)

اس کی بنیاد اگر زہد نے ڈالی ہوتی

دین کی طرح یہ دنیا بھی خیالی ہوتی

(اعزاز افضل)

مگر خدا کی تمنا حباب جیسی ہے

یہ خواب گاہ کسی قصر آب جیسی ہے

(ساقی فاروقی)

آگہی نے جو کہا کہنا پڑا

واہمے کو بھی خدا کہنا پڑ

(اعزاز افضل)

وہاں اچھال کے پھینکا ہے موجِ دل نے مجھے

جہاں سے خلق بھی غائب تھی اور خدا بھی نہ تھا

(ظفر اقبال)

موسیٰ بھی آج نیل کے طوفاں میں بہہ گئے

یہ کس کی جستجو میں نئے سامری چلے

(باقر مہدی)

فرشتے جھاڑیوں میں پھنس گئے ہیں

پیمبر وادیوں کو ڈھونڈھتا ہے

(اسلم عمادی)

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم میں
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی
(عبدالحمید عدم)

شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا
(جوش ملیح آبادی)

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیان میں ہے
بنالی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
(ن م راشد)

کون جانے کے وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی
(ن م راشد)

جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور
جس کی رفعت دیکھ کر خود ہمت یزداں ہے چور
(ن م راشد)

خدا کا جنازہ لئے جارہے ہیں فرشتے
اسی ساحر بے نشاں کا
جو مشرق کا آقا ہے مغرب کا آقا نہیں ہے
(ن م راشد)

الحاد کر رہا ہے مرتب جہان نو
نبیوں کی اور ولیوں کی غارتگری کی خیر
ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبران رفتہ کی حیلہ گری کی خیر
شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغ جہاں میں جلوۂ حور و پری کی خیر

(جاں نثار اختر)

تقدیر کی یہ دروغ گوئی افسوس
برتاؤ یہ رحمت کے منافی افسوس
فاقوں سے مر رہے ہیں ہزاروں بندے
اللہ کی یہ وعدہ خلافی افسوس

(کیفی اعظمی)

یہ سچ ہے اس پہ خدا کا چلا نہیں قابو
مگر ہم اس بت کافر کو رام کر لیں گے
بجائے کعبہ خدا آج کل ہے لندن میں
وہیں پہنچ کے ہم اس سے کلام کر لیں گے

(مسٹر ظفر بی اے)

عقیدے کا نہیں ہونا بھی اک عقیدہ ہے
مجھے الگ نہ سمجھ با عقیدہ لوگوں سے

(نامعلوم)

عجب کیف اب کے عبادت میں ہے
بڑا لطف پچھلے گناہوں میں تھا
خدا اپنی وسعت میں سمٹا رہا
میں بکھرا ہوا اس کی راہوں میں تھا

(سلطان اختر)

جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی
خدا خدا نہ سہی رام رام ہی کر لیں گے

(ظفر بی اے)

روشنی کا سبب ہے تاریکی
سرحدیں صاف کفر و دیں میں نہیں

(مظفر حنفی)

خدا ایک احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

(بشیر بدر)

دعا کے ہاتھ بھی پتھرا گئے ہیں
خدا ہر ذہن میں ٹوٹا پڑا ہے

(ندا فاضلی)

تجلیاں گڑھ رہی ہیں سورج سیاہیاں بُن رہی ہیں راتیں
خدا اور ابلیس کی شراکت میں چل رہا ہے یہ کارخانہ

(جمیل مظہری)

اس برفیلی سردی میں/مسجد کے بند دروازے پر/کھڑا کھڑا کیوں کانپ رہا ہے

لے مجھ سے ماچس کی تیلی/آگ لگادے اس مسجد کو/اور رگوں میں گرمی بھر لے

(شمیم انور)

مجھے اس کا دکھ ہے/کہ میں نے تجھے/آج تک کیوں نہ جانا خدا/اے خدا/میں سمجھتا تھا تو/اک ظالم ہے جو/مجھ پر ظلم وستم ڈھا رہا ہے/مجھے یہ خبر ہی نہیں تھی/کہ تو بھی/دکھی ہے/اکیلا ہے/میں اور تو ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں (محمد علوی)

ان خیالات ونظریات کی حمایت میں ممکن ہے ہمارے ادب کے جو جغادریوں کی ایک ٹیم یہ کہتی نظر آئے کہ صاحب آج کے اردو ادب کا ایک بڑا حصہ سیکولر خیالات وافکار سے مزین ہے جس کا مقصد غیر متعصبانہ اور غیر فرقہ وارانہ رواداریوں کے تحت اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کرتا ہے اور پھر جدید ادب میں آج کا انسان جن مسئلوں سے دوچار ہے اسی کا داخلی اظہار ہماری نئی شاعری کا اہم موضوع ہے اگر ہمارے شعراء اور ناقدین اس قدر روشن خیالی کے حامی ہیں تو انہیں اس امر کا بھی احساس ہونا چاہئے کہ شاعری کو مذہب کے خلاف استعمال کرنا بھی صالح ادب کا خون کرنا ہے مذہبی لوگوں کی شخصی زندگی کے بے رنگ کردار وعمل کا اظہار ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ کرنا ہر زمانے کا محبوب مشغلہ رہا ہے لیکن سرے سے مذہب ہی کو حرف ملامت بنانا اور اس کے عقائد ونظریات پر رکیک حملے کرنا کسی بھی انصاف پسند دانشور کے نزدیک شدید جرم کے مترادف ہے اس طرح کے خیالات کے اظہار سے جہاں مذہب پسندوں کی دل آزاری ہوتی ہے وہیں ایسے شعرا کفر والحاد کی زنجیر میں اسیر بھی ہو جاتے ہیں اور سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے فکشن نگار سامنے آتے ہیں، سبب کون بنا......؟ آخر میں ایک بات ضرور عرض کروں گا کہ جن ادباء وشعراء کو دین ومذہب عزیز ہے وہ بہر طور ایسے باطل خیالات و نظریات کی ہم نوائی کرنا گوارہ نہیں کرسکتے۔ ایسا نہ ہو کہ پھر حالی کو کہنا پڑے۔

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

☆☆☆☆☆

اردو ادب کی فقہی تنقید

اردو ادب کی تاریخ تنقید میں فقہی تنقید کی اصطلاح شاید نظر نہ آئے لیکن اس کے معنوی وجود سے انکار ممکن نہیں. کیوں کہ مذہبی اعتراضات اور شرعی محاسبہ کی روایت عربی اور فارسی کے علاوہ اردو میں بھی ابتدائے آفرینش سے نظر آتی ہے۔ جسے فتوؤں کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے لیکن ادب کی تاریخ میں اس تصورِ تنقید کو جو مقام ملنا چاہئے وہ مقام اسے حاصل نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں ہمارے دانشوروں نے اسلامی فکر ونظر کی روشنی میں ادب کی تنقید وتحقیق کا کوئی مستقل اور باضابطہ کام نہیں کیا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور مفتیان عظام نے جو خدمات انجام دیں انہیں ایک محدود دائرے میں محصور کر دیا گیا جسے محض مولویانہ اعتراض سمجھ کر ادب کے ایوان سے باہر ہی رکھا گیا۔ محض اس لئے کہ یہ تنقید ہماری فکر ونظر کی گمراہی کے اسباب ونتائج کو واشگاف کرنے میں مصلحت کیشی سے کام نہیں لیتی ہے جو بات اسلامی عقائد ونظریات سے متصادم ہوتی ہے اس کا شرعی محاسبہ کرتی ہے اور اچھے اور برے کا دوٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ تنقید ہمارے ادبا اور شعرا کے نزدیک خالص مذہبی تنقید ہو کر رہ گئی۔ اور اسے ادبی تنقید میں شمار نہیں کیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ادب کو ادب ہی کے اصول وضوابط کے تحت پرکھنے کا نام ادبی تنقید ہے تو ادب کی تاریخ میں مختلف النوع تنقیدی نظریات کی ہمرکابی کیا معنی رکھتے ہیں۔ کوئی مشرقی تصورات تنقید رکھتا ہے تو کوئی مغربی نظریات کا حامل بتایا جاتا ہے اردو ادب کی باضابطہ تنقید کی کہانی الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر وشاعری سے شروع ہوتی ہے اور جدید عہد تک پہنچتے پہنچتے مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، جمالیاتی تنقید اور تاثراتی تنقید اپنے مخصوص نظریات وافکار کی بنیاد پر تاریخ کا ایک حصہ بن گئی مگر فقہی تنقید کا کوئی باب تاریخِ شعر وادب میں نظر نہیں آتا ہے۔ ناقدین نے فقہی تنقید کو مولویانہ باتیں سمجھ کر صرف نظر کیا اس سلسلے میں تحقیق وتفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہمارے ناقدین

سماجی تنقید یا مارکسی تنقید کے نظریات اور نظامِ فکر وفلسفہ کارل مارکس اور اینگو کے گھر سے لاکر ادب پر تھوپ سکتے ہیں ۔نفسیاتی تنقید کیلئے فرائڈ کا تصورِ جنس (sex) قبول کر سکتے ہیں جمالیاتی تنقید کے خیالات کروچے کے یہاں سے مانگ کر لا سکتے ہیں تأثراتی تنقید کے لئے ٹی ایس ایلیٹ کے افکار خود پر مسلط کر سکتے ہیں مگر فقہی تنقید جو شعروادب کو اسلامی فکرونظر کی روشنی میں آفاقیت سے ہمکنار کرتی ہے اس سے اجتناب کرنے میں عافیت تصور کرتے ہیں ۔جبکہ تنقید کیلئے کسی خاص نقطۂ نظر ،نظامِ خیال اور فلسفہ کا ہونا تقریباً ضروری سمجھا گیا ہے ورنہ مختلف نظریات اور رجحانات کی روشنی میں ادب کی تنقید نہ ہوئی ہوتی ۔اس مقام پر اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہمارے بعض ناقدین کسی نظریاتی تنقید کی روشنی میں ادب پر نقد ونظر کے قائل نہیں جس کی ایک طویل بحث ہے ان باتوں کے بعد مجھے فقہی تنقید کا اجمالی تعارف اور غرض وغایت کے متعلق اپنے معروضات پیش کرنا ہے شاید اس سے ہمارے ناقدینِ ادب کی تنقید کے لئے کچھ استفادہ کرسکیں اور موجودہ انتشارِ فکری کو صالح تصورات اور اخلاقی خیالات کی سمت پیش قدمی کا موقع فراہم کریں۔

لفظ فقہ عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کا لغوی معنی شق کرنا ،کھولنا ،سمجھ اور فہم کے ہوتے ہیں ۔زمخشری نے فائق میں لکھا ہے کہ فقہ بمعنی کسی شے کو کھولنا اور واضح کرنا اور **در المختار** میں ہے کہ فقہ بمعنی کسی شئی کی حقیقت کو جاننا اسی سے فقیہہ ہے وہ شخص جو کہ احکام شرعیہ کو واضح کرے جب لفظ فقہ علم شریعت کے لئے مخصوص ہوگیا تو اس کی تعریف شرح مسلم الثبوت میں اس طرح کی گئی۔

''اس حکمت شرعیہ کا نام فقہ ہے جس کا تعلق عقائد سے نہیں بلکہ احکام سے ہے دراصل اسلامی علوم و فنون میں فقہ اور اصول فقہ ایک مستقبل باب ہے ۔فقہ کا علم عقلی علوم وفنون کی طرح خود ساختہ نہیں بلکہ قرآن وحدیث اس علم کا بنیادی سرچشمہ ہیں فقہ ان مسائل وجزیات کے مجموعۂ علم کا نام ہے جو ایک مومن کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور جنہیں مجتہدینِ اسلام نے قرآن وحدیث کے اصول وکلیات سے اخذ کیا ہے ۔فقہ کے بنیادی مآخذ چار ہیں (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) اجماع (۴) قیاس،

فقہی تنقید کا پہلا بنیادی مآخذ قرآن کریم ہے جو ربانی اصولِ حیات اور بے خطا تنقیدی

تصور پر مبنی ہے۔ قرآن کا دعویٰ مع دلیل ہے کہ اس کے حقائق کی بہترین تعبیر وتشریح اس کی آیات میں موجود ہیں۔ فقہی تنقید کے لئے قرآنِ حکیم کا تنقیدی اصول سورہ شعراء کی آخری آیات میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ ''اور شاعروں کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔ کیا تو نے نہ دیکھا کہ وہ ہر نالے میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔ مگر وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور بکثرت اللہ کی یاد کی اور بدلا لیا اس کے بعد کہ ان پر ظلم ہوا۔ یعنی ان کے لئے وہ حکم نہیں۔ (پ ۱۹ ع ۱۵ شعراء) مذکورہ آیات کریمہ کے پیش نظر تنقیدی نکات کچھ اس طرح ہوں گے۔

(۱) اکثر شعراء ہر وادی میں بھٹکتے ہیں .اور انتشار فکر کا شکار ہو جاتے ہیں (۲) یہ شعرأ بے عمل یا بدعمل ہوتے ہیں (۳) لیکن ایسے بھی شعراء ہیں جن کے خیال بھی درست ہوتے ہیں اور عمل بھی (۴) بد عقیدہ اور بے کردار شعرأ کی پیروی کرنے والے گمراہ ہیں (۵) نغمۂ شعر اگر مظلوم کی فریاد اور ظالموں کے خلاف بلند ہو تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ بہتر ہے۔ اگر ان نکات کی تعبیر وتشریح اور احوال وکوائف پر تھوڑی بھی توجہ صرف کریں تو فقہی تنقید کے مزاج اور دائرۂ کار سے واقفیت ہو جائے گی۔ فقہی تنقید کیلئے حدیث پاک کو بھی اصول نقد کا درجۂ اعتبار حاصل ہے چونکہ قرآن فہمی بھی حدیث کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اس لئے حدیثِ رسول کی اہمیت فقہی تنقید کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حدیث رسول میں شعر وادب اور شعرأ کے متعلق خاصہ مواد ملتا ہے۔ جس سے فقہی تنقید کے لئے بہتر اصول مرتب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں چند ایسی احادیث درج کر رہا ہوں جو شاعری کی براہ راست تنقید فرماتی ہے اور شعرأ کی بھی حیثیت واضح کرتی ہے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شعر کا ذکر آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ ایک کلام ہے اچھا ہے تو اچھا ہے اور برا ہے تو برا ہے

(۲) صحیح بخاری میں ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض اشعار حکمت ہیں

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حسان سے یہ فرماتے سنا کہ روح القدس ہمیشہ تمہاری تائید میں ہے جب تک تم اللہ و رسول کی طرف سے مدافعت کرتے رہو گے

(۴) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے جو اسے ضائع کر دے یہ بہتر ہے اس سے کہ شعر سے بھرا ہو۔

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ اشعار اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اگر اللہ و رسول کی تعریف کے اشعار ہوں یا ان میں حکمت کی باتیں ہوں، اچھے اخلاق کی تعلیم ہو تو اچھے ہیں اور اگر لغو و باطل پر مشتمل ہوں تو برے ہیں۔ اس طرح کردار و عمل اور فکر و اعتقاد کے لحاظ سے شعرا اچھے اور برے ہوتے ہیں۔ فقہی تنقید کے اصول و ضوابط قانون اسلام سے ماخذ ہوتے ہیں اس لئے فقہی تنقید اپنے مخصوص دائرۂ کار میں رہ کر شعر و ادب کو پرکھتی اور دیکھتی ہے امر و نہی کے اساس پر قائم ہے اس طرح فقہی تنقید کے نزدیک ادب کے دو حصے قائم ہوتے ہیں۔

(۱) جائز ادب (۲) نا جائز ادب

اجائز ادب: (الف) فقہی تنقید جائز ادب اسے قرار دیتی ہے جس میں پاکیزہ جذبات اور صالح خیالات ہوں، جس میں انسانیت کی فلاح و بہبود شامل ہو اور قوانین اسلام سے متصادم نہ ہو (ب) جس ادب میں اللہ اور رسول کی تعریف و توصیف ہو اور اخلاق و معارف کو بیان کیا گیا ہو (ج) وہ ادب جو ان برائیوں سے پاک ہو جو نا جائز ادب میں ہوتی ہیں، اور تفریح کے لئے ہو تو وہ بھی پاکیزہ تفریح ہو برائی کی طرف نہ لے جانے والا ہو۔

نا جائز ادب: (۱) فقہی تنقید نا جائز ادب اسے قرار دیتی ہے جو انسان کے اندر برے خیالات پیدا کرے چاہے اس میں حسن کلام اور تاثیر کی بے پناہ قوت ہو۔ مثلاً خدا پرستی سے الحاد کی طرف لے جائے یا اس میں شک و تذبذب پیدا کرے، واضح حقائق کے مقابلے میں تذبذب اور شبہات پیدا کرے کہ انسان وہم گمان کا شکار ہو جائے اسے توحید و رسالت اور آخرت کی حقیقتوں کے معاملے

میں بے یقینی میں مبتلا کرے (۲) فقہی تنقید ایسے ادب کو بھی ناجائز قرار دیتی ہے جو انسان کے اندر جبریت کا عقیدہ پیدا کرے۔ اسے یقین دلائے کہ اس عالم میں مجبور ہے جو گناہ کرتا ہے مجبوری سے کرتا ہے۔ دنیا کا نظام ہی ایسا ہے کہ تو برائی کرتا رہے۔ جو احساس ذمہ داری کو ذائل کردے (۳) فقہی تنقید کے نظر میں ایسا ادب بھی ناجائز ہے جو انسان کو یاس وقنوطیت میں مبتلا کردے اور وہ سمجھنے لگے کہ نوع انسانی کے قسمت کے روشن ومنور ہونے کے امکانات نہیں (۴) فقہی تنقید اس ادب پارے کو بھی ناجائز کہتی ہے جو انسان کے اندر برے اور غیر اخلاقی جذبات کو ابھارتے ہوں مثلاً نسل پرستی، ملک پرستی، قوم پرستی، قبیلہ پرستی وغیرہ، نفرت وعداوت کے جذبات ابھارنا، بے جا خودنمائی کرنا اور دوسرے انسان کو حقیر تصور کرنا، طبقاتی اور غیر انسانی کشمکش پیدا کرکے اپنی ذاتی تسکین کا سامان کرنا اور حق وباطل کا لحاظ نہ رکھنا یہ ساری چیزیں ناجائز ہیں (۵) فقہی تنقید انسانی جذبات کو ابھارنے والے ادب اور فحاشی وبے حیائی کو پیش کرنے والے ادب کو ناجائز قرار دیتی ہے (۶) ایسا ادب بھی فقہی تنقید کے نزدیک ناجائز ہے جو انسان کے لئے برائیوں کو خوشنما اور بھلائیوں کو بدنما بنائے جس میں نیکی اور پرہیزگاری کا مذاق اڑایا جائے اور بداخلاق لوگوں کو انسانیت کا نمونہ قرار دیا جائے مختصراً ایسے سارے رجحانات ناجائز ادب کی تعریف میں آتے ہیں۔ ادب کے کسی بھی صنف میں خواہ نثر میں ہو یا نظم کی صورت میں فقہی تنقید ممکن ہے۔ ادب کی تمام اصناف کے شہ پاروں کی معنویت پر حق وباطل خیر وشر اور اچھے برے کے درمیان حد فاصل قائم کرتی ہے اندھیرے اور اجالے کی تصویر کو نہایت واضح انداز میں بیان کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دلائل اور براہین دے کر خواب اور حقیقت کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ فقہی تنقید نیکی اور برائی کے درمیان سمجھوتے اور سودے بازی کا قائل نہیں، یہ اضداد کے مرکبات سے ایسے نظامِ فکر وشعور کی ہم نوائی اور ترجمانی نہیں کرتی جو انسان کو تشکیک وتذبذب میں مبتلا کردے۔ فقہی تنقید اپنے مخصوص تقابلی طرزِ فکر میں ایمان اور کفر کو توحید اور شرک کو خلوص اور نفاق کو شکر اور ناشکری کو، صبر اور بے صبری کو شجاعت اور بزدلی کو آخرت پسندی اور دنیا پرستی کو اطاعت اور انحراف کو، حیا اور فحاشی کو، سخاوت اور بخل کو نفسانیت اور ایثار کو

ایک دوسرے کے سامنے رکھ کران کے اثرات ونتائج کو بیان کردیتی ہے ان باتوں کو پڑھنے کے بعد آپ خیال فرمائیں گے کہ آخر فقہی تنقید کے اصول کیا ہیں۔ کیوں کہ اب تک جن باتوں کو پیش کیا گیا ہے انہیں فقہی تنقید کا نظریاتی پہلواور فکری نظام سے تعبیر کریں گے۔ فقہی تنقید کا عملی پہلو کیا ہے۔ یہ کس طرح ادب کی تنقید کرتی ہے اس کے لئے اسلامی ناقدین نے کیا اصول طے کئے ہیں۔ یہاں چند اصولی باتیں پیش کی جارہی ہیں۔ فقہی تنقید کے چند بنیادی اصول ۔ (۱) تمام معتبر فقہ کی کتابوں میں ہے کہ صریح لفظ میں تاویل کی گنجائش نہیں نیز یہ کہ تاویل بھی اگر ہو تو صحیح اور موید بالدلیل اس وجہ سے کہ تاویل بلادلیل نامقبول ہے۔

(۲) جواحتمال کسی دلیل کے تحت نہ ہو غیر معتبر ہے۔(۳) ہم (یعنی فقہائے کرام) لفظ صریح کے مفہوم پر حکم لگاتے ہیں اور ہمارا فتویٰ ہے کہ تم صریح کفریہ الفاظ جب بھی بولو گے کافر ہو جاؤ گے۔ خواہ تمہاری مراد یہ نہ ہو۔ کیوں کہ ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں۔ اگر کسی لفظ میں چند معانی کا احتمال ہواور ان میں ایک معنیٰ ظاہر ہوں تو حکم اسی اعتبار سے ہوگا۔ اوراسی طرح اس وقت جبکہ تمام معنیٰ برابر ہوں لیکن ایک معنیٰ کے لئے کوئی وجہ ترجیح ہو تو بھی اسی پر حکم لگے گا۔ مراد اور عدم مراد سے ہم کو کچھ کام نہیں۔ یعنی قائل کا قول اگر چند معنیٰ کا متحمل ہے تو ان میں سے جو معنیٰ اظہر ہوں گے تو کلمہ اس پر محمول ہوگا اور نیت سے کوئی غرض نہ ہوگی اور اگر اس کا ظہور سب میں مساوی ہو اور ایک معنیٰ کے واسطے مثلاً قرینہ وغیرہ مرجح ہو تو اس مرجح معنی پر عمل کریں گے۔(نسیم الریاض)(۴) کسی شخص نے زبان سے کفر بکا لیکن دل میں ایمان تھا تو وہ کافر ہے۔ اللہ کے نزدیک بھی مومن نہیں (فتاویٰ قاضی خاں) ایک ادیب کو ایسا لفظ جو وحدانیت ورسالت اور ضروریات دین کا منکر بنادے۔ اپنے ادب میں استعمال کرنے سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ کیوں کہ یہ حبطِ اعمال کا سبب ہے۔ خواہ مذاق میں ہو یا توہین میں یہ الفاظ ہی مخبری کردیتے ہیں کہ مراد کیا ہے اس لئے فقہی تنقید ظاہری معنوں پر ہی قائم ہوتی ہے۔ شعروادب کے لئے فقہی تنقید کا مطالعہ بہت ضروری ہے اگر اس کے اصول وقوانین ادیب وناقد اور شاعر کے پیشِ نگاہ رہیں تو انسانیت کی فلاح وبہبود کے ساتھ ادب کی خاطر خواہ خدمت بھی ہوسکے گی

۔اس انتشار کے دور میں جہاں مختلف نظریات اپنی اپنی انفرادی ڈگر پر کام کررہے ہیں اور ایک نظریہ دوسرے نظرئے کو بے بنیاد اور بے سروپا بنا رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہی تنقید پر مفصل کام کیا جائے اس کے اغراض و مقاصد اور اصول وضوابط کو عام کیا جائے سوالات اٹھائے جائیں اور پھر ادبی وفقہی مسائل کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو ایک تنقید کی اچھی اور مناسب راہ مل سکتی ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کو فقہائے کرام سے کیوں اختلاف ہے۔ شعروادب پر فتوے کیوں کیسے اور کب صادر ہوتے ہیں اس کے اصول کیا ہیں کون سا ادب فقہائے کرام کے نزدیک قابل قبول ہے اور کیوں ہے ادب کو مذہب سے اور مذہب کو ادب سے کہاں اختلاف ہے اور کہاں اتحاد ہے اور اس طرح کے بے شمار سوالات اٹھائے جائیں تا کہ جو تخریبی ادب کا سیلاب امڈ پڑا ہے اس کے مقابل تعمیری، اصلاحی، اخلاقی اور انسانی ادب کی تعمیر وتشکیل ہوسکے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ فقہی تنقید کا عظیم سرمایہ فتوؤں کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ کوئی قابل قدر فقیہہ ایسا نہیں گذرا ہوگا جس نے شعروں پر شرعی احکام صادر نہ کئے ہوں۔ فی الحال میرے سامنے فتاویٰ رضویہ کی چھٹی جلد ہے۔ جس میں امام احمد رضا فاضل بریلوی نے تقریباً چالیس یا پچاس اشعار کی فقہی تنقید فرمائی ہے اس کے بعد ’’ایک اہم فتویٰ،، کے نام سے حضور مفتی اعظم ہند نے گویا فقہی تنقید کا حق ادا فرما دیا ہے جسکا مولینا محمد احمد مصباحی نے تجزیاتی مطالعہ فرمایا۔ یہ مقالہ حجاز جدید میں شائع ہوا۔ اردو شاعری شرعی محاسبہ ایک مقالہ کی صورت میں مولینا قمرالحسن قمر بستوی نے تحریر فرمایا۔ نیز راقم الحروف نے ’’نئی شاعری کا مذہب،، کے عنوان سے اردو شاعری کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا تقریباً دس سال قبل ڈاکٹر شمیم گوہر نے بہت سے قابلِ گرفت اشعار سے متعلق ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا اگر یہ سارے مقالات ومضامین کتابی صورت میں شائع ہوں تو فقہی تنقید کی اچھی روایت کو مزید استحکام مل سکتا ہے :

☆☆☆☆☆

فقہی تنقید نگاری

فقہی تنقید کی اصطلاح کے متعلق ارباب علم ودانش کے خیالات کیا ہوں گے۔اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مناسب یہ ہوگا کہ میں بذات خود فقہی تنقید کی اصطلاح کے متعلق اپنے خیالات پیش کردوں۔ممکن ہے اس وضاحت سے ہمارے فقہائے کرام اور علمائے ادب مذکورہ مسائل کو علمی و تحقیقی انداز میں پیش فرمائیں۔

دراصل یہ اصطلاح میرے ذہن میں بار باراس وقت دستک دینے لگی تھی جب میں اردو ادب کی نظریاتی تنقید کے مطالعہ کے بعد فتاوی رضویہ کی چھٹی جلد کا مطالعہ کر رہا تھا۔جس میں امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے بہت سے اشعار کا شرعی محاسبہ فرمایا تھا۔حسن اتفاق اسی دوران حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کا ایک فتوی بھی نظر سے گذرا جس میں تین چار اشعار کے متعلق انتہائی تحقیقی انداز سے تفقہ فی الدین کو پیش کیا گیا ہے۔اسی کے ساتھ اس ایک فتوے پر بیس جید علماء فقہائے کرام کے دستخط اور تصدیقات بھی موجود ہیں۔مزید برآں چار عدد مختصر فتوے بھی شامل کیے گئے تھے جو ایک کتابی صورت میں زیر مطالعہ آئے۔

اس طرح فقہی تنقید کی اصطلاح میرے حاشیۂ ذہن پر ایک مربوط نظام خیال کے ساتھ ابھری جس کے دو اہم اسباب ہیں۔ایک اردو ادب میں مختلف النوع نظریاتی تنقید کا مطالعہ اور دوسرا علمائے فقہ کے وہ فتوے جو براہ راست اشعار کے متعلق تھے جس کی روشنی میں ایک مقالہ ’’اردو ادب کی فقہی تنقید‘‘ میں میں نے تحریر کیا۔راقم الحروف نے فقہی تنقید کی تعریف اور غرض وغایت کے ساتھ چند اصول بھی فتاویٰ سے اخذ کر کے پیش کیے۔اس کے باوجود فقہی تنقید کے بے شمار گوشے ایسے ہیں جن پر عمیق نظری سے توجہ دینے کی بے پناہ ضرورت ہے۔

میرے نزدیک فقہی تنقید اس تصور تنقید کا نام ہے جو علم فقہ کی روشنی میں ادبی اصول نقد ونظر کے مکمل اشتراک سے وجود میں آئی ہو۔اگر تنقید صرف علم فقہ کے دائرے میں گردش تمام کرلیتی ہے اور ادبی تقاضوں سے صرف نظر کرتی ہوئی گزر جاتی ہے تو اسے بجا طور پر فتویٰ کے نام سے تعبیر کریں گے

کیونکہ عملی لحاظ سے فتویٰ نویسی کا ایک جداگانہ مزاج، زبان، طرز استدلال اور مخصوص دائرہ کار ہوتا ہے
اسی طرح اگر تنقید ادبی اصول وضوابط پر قائم رہتے ہوئے فنکاروں کے حسن وقبح کو واضح کرتی ہے اور علم
فقہ سے اکتساب نور نہیں کرتی ہے تو اسے ادبی تنقید ہی کے نام سے تعبیر کریں گے اس مقام پر یہ اعتراض
لازم آتا ہے کہ تاریخ تنقید میں مختلف تنقیدی صورتیں جو نظر آتی ہیں انہیں بہر طور ادب کی تاریخ میں ادبی
تنقید ہی شمار کیا جاتا ہے مارکسی تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، مغربی تنقید، مشرقی
تنقید وغیرہ وغیرہ جیسے کتنے مخصوص تنقیدی نظریات ملتے ہیں اور ساری تنقیدیں ہمارے ادب کی تاریخ
میں ''ادبی تنقید'' ہی کہلاتی ہیں اس نہج پر فقہی تنقید کو ادبی تنقید کے نام سے بہر طور تعبیر کریں گے۔ دراصل
یہی بات میں نے پہلے بھی کہی تھی مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف ادبی تاریخ کے دامن میں فقہی تنقید کا
کوئی باب نہیں اور دوسری ایک اہم بات یہ ہے کہ فتاوے کو فقہی تنقید سے الگ تھلگ رکھنا بھی ضروری
ہے تاکہ دونوں کی انفرادیت برقرار رہے اور پھر ادبی تاریخ کے دامن میں فقہی تنقید کے نام سے ایک
درخشاں ستارہ ٹانکنے کا اہم مرحلہ ہے اسے اپنی شناخت کرنی ہے۔ ایک مخصوص نظریۂ تنقید پیش کرنا ہے
تاکہ ادب اور مذہب کے درمیان جو فاصلے اور خلیج پیدا کردیے گئے ہیں انہیں ایک صراط مستقیم مل جائے۔
ادباء وشعرا اور علماء وفقہاء کے درمیان جو نظریاتی سرد جنگ چل رہی ہے، اسے امن وامان کا گلشن مل
جائے۔ کیوں کہ اس ٹکراؤ میں مذہبی ادیب وشاعر کا کردار مجروح ہوتا ہے جنہیں مذہب سے کوئی علاقہ
نہیں ان کی بات چھوڑیئے لیکن مذہبی شعراء وادباً کو بہر طور فقہی تنقید سے واقف ہونا لازمی ہے۔

بہر حال جب یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ فقہی تنقید کا کام فتوی دینا نہیں ہے صرف علم فقہ کی
روشنی میں ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سے ابھرنے والے مسائل کا ادبی وفقہی اصولوں پر
تجزیہ کرنا ہے اور ادب کے عصری رجحانات ومیلانات کو فقہی اصولوں کی روشنی میں پرکھ کر جو
مزاج وخیال مذہب سے متصادم نہ ہو انہیں قبول کرے۔ اور جن تصورات وخیالات سے قباحت
لازم آئے انہیں نہایت خوشگوار اسلوب میں بیان کرے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ایک فقہی
تنقید نگار کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ آداب شریعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ ضروریات دین
کا خصوصی علم وشعور رکھتا ہو۔ اسی کے ساتھ ادبی میلانات ورجحانات میں وہ عوامل جن سے تضاد شعر و

شریعت کا پہلو نکلتا ہے اس پر گہری نگاہ رکھے۔ایک فقہی تنقید نگار پر دوسری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تخلیق ادب کے لیے ایسی فضا قائم کرے جس سے مذہب اور ادب کے مابین اخلاقی و روحانی قدروں کی زنجیریں بن جائیں اور آفاقی ادب کی طرف فکر و نظر کا قافلہ چل پڑے۔

چونکہ فقہی تنقید کی حیثیت معروضی زیادہ ہے اور موضوعی کم اور فتویٰ نویسی کا منصب احکام صادر کرنا ہے۔اس لیے فقہی تنقید نگار کو اپنے مخصوص دائرہ کار میں رہ کر اپنے خیالات و افکار سے تزئین سخن کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔اس مقام پر ایک اعتراض لازم آتا ہے کہ جب فقہی ناقد علوم شرعیہ سے بہرہ ور ہے تو اس صورت میں کون سی قباحت لازم آتی ہے؟اس سلسلہ میں بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن یہاں محض اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تفقہ فی الدین سے مشرف ہونے والی شخصیت ہی سے اعتقادیات اور اسلامی زندگی کے مسائل دریافت کیے جاتے ہیں۔علم فقہ کے تمام جزیات و کلیات ایک فقہی ناقد کے پیش نگاہ ہو کوئی ضروری نہیں ہے جبکہ ایک مفتی دین منصب افتاء پر اسی وقت متمکن ہوتا ہے جب اسے علم فقہ پر کامل دسترس ہونے کے علاوہ دیگر اسلامی علوم مثلاً حدیث،اصول حدیث،تفسیر،اصول تفسیر،لغت،ادب،تصوف،علم قرآن اور ان کے جزیات و کلیات کا بھرپور علم و ادراک کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

دراصل ایک فقیہ کا منصب اور ایک فقہی ناقد کے منصب میں بعض بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے لیکن اگر خوش نصیبی سے کوئی صاحب علم ادبی اصول کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شعر و ادب کی پرکھ کرتا ہے تو اسے فقہی تنقید کے ساتھ فتویٰ کہنے میں کوئی حرج نہیں۔کیونکہ ایک فقیہ کی فکر و نظر میں حیات و کائنات کے باریک سے باریک مسائل بھی بہر طور ہوتے ہیں مگر ایسی شخصیت خال خال ہی نظر آتی ہے ناقلِ فتوی ہونا اور ایک باضابطہ فقیہ ہونا دو مختلف چیزیں ہیں۔

ناقدین ادب بھی اس بات پر متفق ہیں کہ ادب پر تنقید کے مختلف مدارج ہیں۔عوام زیادہ تر ادب کو وقت گذاری اور تفریح طبع کے لیے پڑھتے ہیں۔ان کی تنقید محض ذوقی تاثرات تک محدود ہوتی ہے ان کی پسند اور ناپسند کا معیار انتہائی سادہ اور عامیانہ ہوتا ہے ان میں گہرائی و گیرائی کا حد درجہ فقدان ہوتا ہے اس لئے ادبی تنقید کے اصول و ضوابط ان کے معیار پر مرتب نہیں کیے جاتے

ہیں ۔اس کے برعکس ایک ناقد جب کسی ادبی فن پارے پر اپنی رائے دیتا ہے تو اسے ادبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر اصول نقد ونظر کی ہمرکابی میں کلام کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح انداز میں پیش کرنا پڑتا ہے کہ اس کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور کیسے کیسے نقائص ہیں۔

چونکہ فقہی تنقید نگاری کے بیشتر گوشے ابھی تک سامنے نہیں آئے ہیں لہٰذا وہ تمام فتاوے جو براہ راست شعروادب سے متعلق صادر ہوئے ہیں اور وہ احکامات وارشادات جو قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے پیش فرمائے ہیں انھیں عام کرنا ضروری ہے اس لیے ہمیں ایسے استفسار ترتیب دے کر پیش کرنا ضروری ہے، جن کا تعلق فقہی تنقید سے ہو۔ چند ایسے ہی سوالات پیش کرتا ہوں جو فقہی تنقید کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور جن کا علم فقہی تنقید نگار کے لیے لازمی ہے۔

فقہی تنقید کے چند بنیادی نکات بصورتِ سوال پیشِ نگاہ رکھیں۔

(۱) لفظ صریح کسے کہتے ہیں؟

(۲) صریح لفظ کا اطلاق کن بنیادوں پر ہوتا ہے؟

(۳) علم فقہ کی روشنی میں الفاظ کے اقسام کس طرح بیان کیے گئے ہیں یا کس طرح متعین کیے گئے ہیں؟

(۴) فقہائے کرام نے فرمایا کہ لفظ صریح میں تاویل کی گنجائش نہیں آخر اس میں کیا حکمت ہے؟

(۵) فقہاٗ فرماتے ہیں جو احتمال کسی دلیل کے تحت نہ ہو غیر معتبر ہے لیکن شاعری میں تو احتمال بہر طور واقع ہوتے ہیں اس صورت میں کیسی دلیل قابل قبول ہوگی اور کن دلیلوں کو رد کر دیا جائے؟

(۶) لغوی معنیٰ اور مجازی معنیٰ میں کافی فرق ہوتا ہے اور بعض الفاظ لغوی اعتبار سے بھی کئی کئی معنیٰ رکھتے ہیں اسکے علاوہ شاعری میں مجازی معنیٰ ہی زیادہ تر استعمال کیے جاتے ہیں اس صورت میں لفظ صریح کا اطلاق کس طرح ہوتا ہے؟

(۷) کنایہ، استعارہ، تشبیہ، پیکر، علامت اور دیگر لفظی اقسام کے درمیان صریح کا حکم کن صورتوں میں ہوگا؟

(۸) تاویل کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ کس طرح تاویل کو درجۂ اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ تاویل کی کتنی قسمیں ہیں۔ کون سی تاویل فقہائے کرام کے نزدیک معتبر ہے۔ کس طرح کی تاویلات غیر معتبر ہیں؟

(۹) لفظ کے مخصوص معنی جو لغت میں درج ہوتے ہیں، اکثر تغیر و تبدل کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔ ایک لفظ کا معنی ایک عہد میں اچھا ہوتا ہے اور وہی دوسرے عہد میں برا معنی دینے لگتا ہے۔ اکثر یوں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض الفاظ ایک خطے میں اچھے معنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر دوسرے خطے میں وہی الفاظ برے معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر فقہی احکام کس طرح نافذ ہوں گے۔ کیا عرف کے پیش نظر احکام نافذ ہوں گے؟ کیا عرف ہی کی بنیاد پر لفظ کا معنی اور مفہوم متعین ہوگا؟

(۱۰) اگر قائل کا قول چند معانی کا محتمل ہے ان میں ایک معنی کفر و ضلالت کی طرف ذہن کو لیے جارہا ہے اور دوسرا معنی ان عیوب سے پاک ہے تو اس عالم میں کیا حکم شرع نافذ ہوگا؟۔

(۱۱) اگر کسی کلام میں اجمال اور ابہام ہو اور کوئی معنی ظاہر نہ ہو تو کیا حکم آئے گا؟ کیا نیت اور مراد کا اعتبار نہیں؟۔

(۱۲) اگر تمام معانی برابر ہوں لیکن ایک معنی کے لیے وجہ ترجیح ہو تو کس طرح کا حکم آئے گا؟ وجہ ترجیح کی کیا کیا صورتیں ہیں؟۔

(۱۳) اگر کلام میں اثبات بھی ہو اور نفی بھی تو کیا احکام ہوں گے؟۔

(۱۴) کیا صرف انھیں الفاظ پر کفر کے فتوے عاید ہوتے ہیں جو صراحت کے ساتھ معنیِ کفر پر دلالت کرتے ہیں؟

(۱۵) احتمال کی تعریف کیا ہے؟ احتمال کی قسمیں کیا ہیں؟

(۱۶) ابہام اور احتمال میں کیا فرق ہے؟

(۱۷) تبادر ذہنی کی تعریف کیا ہے؟ اس کی آخر نہ سہی، صحیح سمت کا تعین کس طرح ہوگا؟

(۱۸) اگر الفاظ ذو معانی ہوں قریب و بعید، سننے والے کا ذہن معنی قریب کی طرف سبقت کرے

اور متکلم کی مرادمعنیِ بعید ہوتو اس صورت میں کیا حکم نافذ ہوگا؟

(۱۹) شاعری کی فقہی تنقید کیا الفاظ و معانی کے علاوہ عصری تقاضے،،ادبی رسومات وروایات، مذاق عام کی دلچسپی، شاعر کی سوانح وغیرہ کو بھی بنیاد بنائے جاتے ہیں یا صرف متنِ شعر پر فقہی احکام نافذ کردیے جاتے ہیں؟

(۲۰) صوفیانہ شاعری میں بعض اصطلاحات ایسی نظر آتی ہیں جوان کی اپنی وضع کردہ ہیں اور وہ ضروریاتِ دین سے بظاہر ٹکراتی ہیں۔ ایسی شاعری پر فقہی تنقید کس انداز میں کی جائے گی؟ اگر کسی شاعر نے جو صوفیوں کے گروہ سے تعلق بھی نہیں رکھتا اور صوفی بھی نہیں ہے اس نے صوفیانہ شاعری سے متاثر ہوکر ان کی اصطلاحات کو اپنے اشعار میں نظم کردیا تو اس صورت میں اس پر کیا حکم نافذ ہوگا؟

(۲۱) ناقدین ادب کا اس امر کے متعلق اتفاق ہے کہ انسان ندرت وجدت، اختراع وایجاد، نئی راہیں نکالنا یا رواج عام سے الگ چلنے کی فطری خواہش رکھتا ہے شعر وادب میں یہی چیزیں تنوع اور رنگارنگی پیدا کرتی ہیں۔ شاعری میں ان رویوں اور تجربوں کی تین سطحیں نظر آتی ہیں۔ پہلی سطح شعری تجربہ ہے جہاں تخلیقی عمل کے ذریعہ فکر اور محسوسات کو مخصوص انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ شعری تجربہ انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ دوسرا شعری تجربہ کی سطح ہیئتی تجربہ ہے اور شعری تجربہ کی تیسری سطح لسانیاتی تجربہ ہے۔ ان تجربوں کو سامنے رکھ کر فقہی تنقید کا تصور پیش کرنا ادب و مذہب دونوں کے لیے مناسب ہے اس سلسلے میں فقہائے کرام کے کیا اصولی اور فروعی احکامات وارشادات ہیں۔

(۲۲) مذکورہ سوالات جو فقہی تنقید نگاری کے تعلق سے ترتیب دیئے گئے ہیں، ان کے جوابات علمِ فکر سے تعلق رکھنے والے فقہائے کرام بڑی آسانی سے عطا کرسکتے ہیں مگر انھیں سوالات اور ان کے جوابات کی صحیح فہم ایک فقہی تنقید نگار کو نہ ہوتو اسے ہر قدم پر ٹھوکر کھانا پڑسکتا ہے۔

☆☆☆☆

اردو ادب میں وحدت ادیان کا تصور

علمائے ادب کے یہاں اس امر کے متعلق ایک حد تک وحدتِ فکر پائی جاتی ہے کہ شعروادب پر جہاں ماضی کی تہذیبی قدریں جلوہ ریز ہوتی ہیں وہیں عصری حالات وواقعات کے اثرات بہرصورت ظہور پذیر ہوتے ہیں کیوں کہ انسان جس فضا میں سانس لیتا ہے جس تہذیب وتمدن کی آغوش میں پروان چڑھا کرتا ہے اس کے اثرات سے اپنے ذہن وفکر کو کس طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ دراصل انسانی فطرت جس فضا میں آنکھ کھولتی ہے اس کے مناظر کو لاشعوری اور شعوری دونوں سطحوں پر محفوظ رکھنا اپنا بنیادی حق سمجھتی ہے اور اسی طرح ایک زمانہ گزرتا جاتا ہے لیکن جب فہم وادراک اور شعور وتدبر کا ارتقاء یونہی سرگرم سفر رہتا ہے تو ایک منزل وہ نظر آتی ہے کہ جہاں تغیر پذیری کے سبب فطرت انسانی کو ردوقبول کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مقام پر راہ راست اور راہ کج کے متعلق فیصلے کی ضرورت پیش آتی ہے جہاں سے زاویۂ فکر ونگاہ کے مختلف دبستان اسی فطرت انسانی کی ہم رکابی میں قائم ہو جاتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں شعروادب کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ فطرت انسانی کی ارتقائی داستان کو بیان کرنے کے لئے ماہرین فنون لطیفہ نے شعروادب کو سب سے زیادہ موزوں اور موثر آلۂ کار قرار دیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ایسا کوئی واقعہ سانحہ یا انقلاب دنیا کے پردے پر ابھرا تو اس کے اثرات شعروادب کے رخ جمال کا رنگین غازہ بنتے نظر آئے۔ مثلاً جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک ابھری تو اس کی ہمنوائی میں شعروادب کو بھی دیکھا گیا۔ اسی طرح آج عالمی سطح پر جب کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے تو اس کے اثرات ایوان شعروادب میں دیکھے جاتے ہیں۔ اب یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر فن پارہ فکروفن کے میزان پر مکمل طور پر کھرا ہی اترے۔ اسی کے ساتھ اثرات کی نوعیت بھی یکساں ہی نظر آئے۔ شعروادب میں منفی ومثبت دونوں قسم کے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اب

غالب قوت جس سمت کا رخ کرلے۔ مثلاً جب تک مشرقی تہذیب غالب قوت میں تھی اس وقت تک سارا سرمایۂ ادب اس کے زیر نگیں تھا لیکن جیسے ہی مغرب کی بالا دستی قائم ہوئی تو عصر حاضر کا شعروادب اسی کی فضاؤں میں ہمکتا نظر آرہا ہے۔

ان دنوں اردو شاعری کے حوالے سے ہمارے بعض ناقدین وحدت ادیان کا تصور پیش کررہے ہیں مگر مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ناقدین ادب وحدت ادیان کے بنیادی نظریات وافکار سے غافل نظر آتے ہیں۔ان کے نزدیک مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا اوروحدت ادیان کے بنیادی تصور میں شاید کوئی فرق نہیں ہے۔اس کے علاوہ بعض ناقدین قومی کلچر، جمہوری فکر، ملک پرستی، انسان دوستی جیسے امور کے لئے وحدت ادیان کے تصور ہی کو بڑے فخروطمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ایک عجیب وغریب بات یہ بھی ہے کہ فرقہ بندی، رجعت پسندی قدامت پرستی جیسے مسائل کے خلاف یہی وظیفہ دہراتے ہیں۔گویا سارے امراض کے لئے نسخۂ شفا ہے وحدت ادیان کا تصوراس لئے ہمیں سب سے پہلے وحدت ادیان کے متعلق تمام حقائق سے روشناس ہونا ازحد ضروری ہے۔

وحدت ادیان کے تصور کو چونکہ تمام مذاہب کا جزو اعظم قرار دیا جارہا ہے اس لئے ہمیں دانشوروں کے نظریات وافکار کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ تمام خدوخال کی وضاحت ہوجائے۔ چوں کہ یہ مسئلہ خالص دین کا ہے لیکن دنیا سے بھی اس کا مضبوط رشتہ قائم ہے اس لئے دین اور دنیا کے ممتاز قائدین کی آرا جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو بنیادی طور پر ذہن کے پردے پر یہ سوالات ابھرتے ہیں:

۱۔اس تصوردین کا سرچشمہ کیا ہے؟ ۲۔اس کے بنیادی عقائد ونظریات کیا ہیں؟

۳۔اہل مذاہب کا اس سے کیا تعلق ہے؟ ۴۔اہل دنیا کا اس سے کیا رشتہ ہے؟

گرچہ پہلے سوال ہی کے ضمن میں تینوں سوالات آگئے ہیں، مگر بعض نوعیت کے پیش نظر الگ الگ سوالات قائم کئے گئے ہیں۔ جب آپ اس تصور دین کے سرچشمہ کی تلاش میں نکلیں گے تو

بنیادی طور پر یہ سوالات آپ کے ذہن وقلب پر ضرور دستک دیں گے اور یوں بھی انسان کسی تصور کو اس وقت تک کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا جب تک وہ ایک تحریک نہ بن جائے۔اس سلسلے میں ہمیں تاریخی طور پر چار باضابطہ تحریکیں نظر آتی ہیں۔مثلاً

۱۔(گمراہ) صوفی تحریک ۲۔بھگتی تحریک

۳۔دین الٰہی ۴۔سیکولرزم یا جمہوریت

اگر ان چاروں تحریکات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا جائے تو باتیں بہت طویل ہو جائیں گی۔اس لئے صرف نظر کرتا ہوں۔مگر ایک بات ضروری عرض کر دوں کہ مذکورہ تحریکوں کا وجود چند جزوی اختلاف کے ساتھ سب میں یکساں ہے۔اگر ان تحریکوں کے وجودی مقاصد کو سامنے رکھیں تو سارے سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اب آیئے دوسرے سوال کی جانب چلتے ہیں۔

وحدتِ ادیان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔مگر اس کے روپ انیک ہیں۔تمام دینوں کی اصل ایک ہے۔اس تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔کوئی مندر میں جائے یا مسجد میں کوئی کلیسا میں جائے یا چاند، سورج، آگ، پانی کو پوجے، سب ایک خدا کے پجاری ہیں۔اس کی عبادت کے لئے کسی خاص طریقے، رسم وتہذیب کی قطعی ضرورت نہیں، کیونکہ تمام مذاہب کی اصل جب ایک ہے۔تمام مخلوقات کا وہی خالق و مالک ہے اور سب کا مقصود اسی کی عبادت اور پوجا ہے تو اس میں اختلاف کی قطعی ضرورت نہیں۔جب خدا کی محبت انسانی فطرت کا اولین تقاضہ ہے، تو اسے کسی نام سے پکارا جائے، کوئی مضائقہ نہیں، کوئی رام کہے، کوئی رحیم کہے، کوئی ایشور کہے، کوئی (God) کہے، کوئی اللہ کہے، یہ مختلف زبانوں میں اسی کے نام ہیں۔لہٰذا سب آپس کے جھگڑے چھوڑو۔اسلام، یہودیت، مجوسیت، بت پرستی، دہریت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے۔خدا کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔اس لئے جس دین کو بھی اپنا لیجئے، جس طرز حیات اور طریقہ عبادت کو اختیار کر لیجئے، جس پیشوائے مذہب سے وابستہ ہو جائیے، پہنچیں گے وہیں جہاں سب کو پہنچنا ہے۔کیوں کہ ایک ہی منزل کے

سب مسافر ہیں۔ جو مختلف دائروں اور سمتوں سے سرگرم سفر ہیں۔

یہاں اجمالی طور پر وحدت ادیان کے عقائد کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے جس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے آیئے تیسرے سوال پر غور کریں۔

اہل مذاہب کا اس تصور دین کے متعلق اختلاف بھی ہے اور اتفاق بھی۔ اختلاف تو اس قدر ہے کہ کوئی بھی ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر مذہب کا مبلغ خود کو حق ثابت کرنے کے لئے اور دوسروں کو غلط ثابت کرنے کے لئے برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔ جہاں ان کے پاس ایک بھی باوزن اور ضمیر و دماغ کو مطمئن کرنے والی ایک بھی دلیل نہ ہو۔ مگر ان ہی اہل مذاہب میں ایک طبقہ ایسا نظر آتا ہے جسے اہل اتحاد کا نام دیا گیا ہے اور بعد میں صوفی تحریک اور بھگتی تحریک کے نام سے ابھرے۔ انہوں نے وحدت ادیان کے تصور کو عام کیا، چونکہ ایک تحریک مسلمان صوفیوں کی تھی اور دوسری ہندو دھرم کے ماننے والوں کی۔ اس لئے عوامی طور پر ان کے نظریات کو مقبولیت ملتی چلی گئی۔ اس طرح وحدت ادیان کے تصور کو فروغ ہوا۔ اب چوتھے سوال کی طرف چلتا ہوں۔

اہل دنیا سے مراد حکومت واقتدار سے منسلک وہ لوگ ہیں جو اپنی حکومت کی سلامتی اور اقتدار کی بحالی کے لئے حکومتی سطح پر کوشاں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ملکی سالمیت کے پیش نظر مذہبی اختلافات کو کچل دینا یا اشتراک کا پہلو نکال لینا ہی بہترین کامیابی ہے۔ کیوں کہ مذہبی اختلافات میں قیامت کی شدت ہوتی ہے اسی تصور کی روشنی میں جلال الدین محمد اکبر پہلا مغل بادشاہ گزرا جس نے اپنے نورتنوں کی ہمرکابی میں ایک نیا دین ''دین الٰہی'' کی بنیاد ڈالی اور وحدت ادیان کے تصور کو عام کیا۔ اس ضمن میں اگر مغربی تہذیب کو پیش نگاہ رکھیں تو خالص سیاسی تحریک کی صورت میں اہل مغرب نے سیکولرزم اور سوشلزم کے نام سے اہل دنیا کو وحدت ادیان کے لئے مغربی جام میں بھر کر رکھ دیا ہے۔

گو کہ آج خالص سیاسی سطح پر یکساں سول کوڈ کا نقشہ ابھارا جا رہا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اس کی پشت پناہی میں وحدت ادیان کا تصور بھی کارفرما نظر آئے گا۔

چونکہ میں نے اردو ادب میں وحدت ادیان کے تصور کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اب تک

محض وحدت ادیان کے غرض وغایت اوراس سے منسلک لوگوں کے نظریات کو پیش کیا ہے۔اب آیئے، شعراء کی طرف چلتے ہیں۔ایک شاعر وحدت ادیان کے تصور کواس طرح پیش کرتا ہے۔

تم رام کہو وہ رحیم کہیں دونوں کی غرض اللہ سے ہے

تم عشق کہو وہ پریم کہیں مطلب تو اسی کی چاہ سے ہے

تم دین کہو وہ دھرم کہیں منشا تو اسی کی راہ سے ہے

وہ یوگی ہو تم سالک ہو مقصود دل آگاہ سے ہے

کیوں لڑتا ہے مورکھ بندے یہ تیری خام خیالی ہے

ہے پیڑ کی جڑ تو ایک وہی ہر مذہب اک اک ڈالی ہے

تکبیر کا جو کچھ مطلب ہے ناقوس کا بھی منشا ہے وہی

تم جن کو نمازیں کہتے ہو ہندو کے لئے پوجا ہے وہی

مذکورہ اشعار سے وحدت ادیان کا نظام خیال روشن ہوتا ہے۔جسے ہمارے دانشوروں اورناقدوں نے وسیع المشربی، روشن خیالی، اعلیٰ ظرفی، جمہوری فکر، انسانی اقدار کی علامت، اخلاقی اور ملی تصور اور بلند مقصد حیات وکائنات کے سنہری القاب سے نوازا ہے اور ہمارے سیاسی رہنماؤں نے ملک وقوم کی لازوال خدمت قرار دیا ہے۔اور جو وظیفہ الیکشن میں کامیابی کا تاج زرّیں بھی عنایت کرتا ہے۔

اس طرح اگر دیکھیں تو ہر شخص اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر وحدت ادیان کی زلفوں کا اسیر نظر آتا ہے جسے نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔شعرأ وادبأ کی جماعت میں وحدت ادیان کے اس تصور کو آفاقی قرار دیا گیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ کوئی ادبی وفکری شہ پارہ دائروں میں بٹی انسانیت کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ تمام انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔اب اگر وحدت ادیان کے تصور سے کوئی شہ پارہ مزین ہو جائے تو گویا وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سبھی کے لئے قابل قبول ہوگا کیونکہ یہی آفاقیت کی بہترین علامت ہے۔

ہمارے ادبأ وشعرأ کا اولین مقصد دراصل کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن پاروں کو شہرت دوام دینے کے چکر میں کبھی کبھی خدا ہی کے وجود کا انکار کر بیٹھتے ہیں اور کبھی خوش فہمیوں کے گنبد بے در میں خود کو بھی خدا بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی آفاقیت کا تصور وحدت ادیان کے تصور سے بھی وسیع وعریض ہوتا ہے۔

اب اخیر میں اسلامی فکر ونظر کی روشنی میں وحدت ادیان کے تصور کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسلام وحدت دین کا مذہب ہے وحدت ادیان کا قائل نہیں۔ قرآن نے وحدت دین کے تصور کو مختلف مقامات میں بیان کیا ہے۔ مثلاً

(الف) اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

(قرآن ۳۵، ۲۴)

(ب) اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے (قرآن ۱۰، ۴۸)

(ج) اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے (قرآن ۴۰، ۷۸)

(د) ابتدأ میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلاف رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راہ راست پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب حق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلاف رونما ہو گئے تھے اس کا فیصلہ کرے (قرآن ۲: ۲۱۳)

(ہ) نظام زندگی تو اللہ کے نزدیک بس "اسلام" ہی ہے (آل عمران)

مذکورہ ارشادات کی روشنی میں وحدت دین کا تصور روشن ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ ہر زمانے کے نبی پر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس کی اطاعت واتباع کو اسلام کہتے ہیں یہاں تک کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یعنی ہر قوم کی الگ الگ قومی رسولوں کے ذریعہ حق وہدایت کی جانب رہنمائی فرمانے کے بعد

اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت نے ایک عالم گیر رسول کی بعثت فرمائی تا کہ پوری انسانیت ایک آفاقی دین کے تصور حقیقی سے روشناس ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضور سید کائنات محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام رسولوں کے بنیادی پیغام کو پیش کرنے کے لئے مبعوث فرمایا۔ اس پیغام سے وہ تمام چیزیں الگ کردی گئیں جو عارضی اور محدود مزاج کی تھیں اور بعد میں کی گئیں آمیزشوں اور غلط تاویلوں کو بھی نکال دیا گیا۔ خدائی پیغام کی غلط ترجمانی وتشریح مختلف قوموں نے الگ الگ دین کا تصور قائم کرلیا تھا۔ جیسا کہ ایک مفکر نے مختلف خیالات وعقائد کا ذکر کیا ہے۔

(۱) خدا کو انسانی شکل اور انسانی جذبات کے ساتھ ایک وجود دینے کا رجحان۔

(۲) ایک اور واحد خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کی شرکت کا تصور (جیسا کہ ہندو دھرم اور عیسائیت میں) پایا جاتا ہے۔

(۳) فرشتوں کو الوہیت کا رنگ دینا (مثال کے طور پر ہندومت میں دیوتا، زرتشتیوں میں یزداں اور شاید عیسائیت میں روح القدس۔)

(۴) رسولوں کو اوتار یا خدا کے انسانی شکل میں آنے کا تصور (جیسے عیسیٰ مسیح عیسائیت میں، بدھ مہامان بدھ مت میں، اور کرشن اور رام ہندومت میں)

(۵) خدا کی صفات کو الگ الگ خدائی ہستیاں تصور کرنا (عیسائیت کی تثلیث: باپ، بیٹا اور روح القدس ہندوؤں کی تثلیث برہما وشنو اور زرتشتیوں کا آمیشا اسفندس)

اس طرح اگر اقوام عالم کی تہذیب وتمدن اور معاشرے میں دیکھا جائے تو اس مسئلے میں ہزاروں اختلاف صرف توحید باری کے سلسلے میں نظر آئے گا جس کے نتیجے میں وحدت ادیان کا بنیادی تصور جو ایک خدا کے متعلق ہے بکھرتا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے شرک آمیز توحیدی تصور میں اتحاد کی فضا دیر پا ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس اسلام کا تصور توحید اپنے اندر اس قدر قوی دلائل رکھتا ہے کہ کسی افراط وتفریط کا شائبہ تک نہیں نظر آتا۔

اسلام کے تصور توحید اور وحدت ادیان کے تصور توحید میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اسلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول کریم تک کے توحیدی تصور کو مکمل اور واضح صورت میں پیش کیا لیکن وحدت ادیان نے انبیاءؑ کے تصور توحید میں ان کے پیروکاروں نے جو ترمیم و تنسیخ کردی ہے اس کی شمولیت کے ساتھ ہی پیش کرتا ہے ورنہ دیگر مذاہب میں خدا کی صفات کو الگ الگ تجسیم کی صورت میں نہ پیش کیا گیا ہوتا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

ہمارے بعض دانشوروں نے یہ بھی کہا ہے کہ دنیا میں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ممکن ہے رام، رحیم، ایشور، پرماتما، گاڈ (God) مختلف زبانوں میں اللہ ہی کا نام ہو۔ اس لئے وحدت کے اس تصور میں اختلاف کرنا فضول ہے۔ جیسا کہ شاعر قمر رام نگری کے یہ اشعار اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

رام رحیم ایشور اللہ سب خالق کے نام　　کسی بھی روپ میں اس کی پوجا کرنا شبھ کام
مسجد مندر اور گردوارے سب ہیں اس کے دھام　　ان کو لے کر یہاں جو جھگڑے ہے مورکھ اگیان

کیوں تم ہو گئے یوں نادان

اصل دھرم ہے سارے ہی دھرموں کی عزت کرنا　　وطن کی الفت میں جینا وطن کی آن میں مرنا
وطن پرستی نہیں ہے پیارے آپس ہی میں لڑنا　　دیس کے سارے بسنے والے ہیں پریوار سمان

کیوں تم ہو گئے یوں نادان

ہمارے بعض دانشوروں کے نزدیک وحدتِ ادیان کا فلسفہ ہندوستان کا قدیم فلسفہ ہے جو دراصل مذہبی اختلافات اور سماجی و تہذیبی ٹکراؤ کے ردعمل کا نتیجہ ہے جہاں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت دیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور بنامِ انسانیت اختلافات کو دور کرنے کا نظریہ بتایا گیا ہے مگر ایک پہلو ایسا بھی ہے جسے کوئی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ توحیدِ خالص کے مقابلے میں شرک آمیز تصور کا پیدا کرنا اور ایمان و کفر کی حدوں کو مسمار کرنا اس فلسفے کا بڑا کارنامہ ہے۔ انسانیت کے نام پر کسی بھی مذہب میں خون خرابے کی گنجائش نہیں۔ اس بنیادی نظریے کے ہوتے ہوئے مفاد پرستوں نے منافقانہ نظریہ عام کیا۔

☆☆☆☆☆

حلیم حاذق

کی

تصنیفات وتالیفات:

(۱)	مرکزِ نور	: نعتوں کا مجموعہ	۱۹۸۵ء
(۲)	فروغ تجلّی	: غیر مسلم شعراء کی نعتوں کا انتخاب	۱۹۸۸ء
(۳)	انمول نعتیں	: معروف شعراء کی نعتوں کا انتخاب	۱۹۸۹ء
(۴)	زنداں بدوش	: حضرت حاذق انصاری کا مجموعہ کلام	۲۰۰۰ء
(۵)	مطلعِ انوار	: حضرت حامی گورکھپوری کی نعتوں کا انتخاب	۲۰۰۱ء
(۶)	لوح افکار	: نعتوں کا مجموعہ	۲۰۰۱ء
(۷)	آگہی گر نہیں	: کلیم حاذق کے تنقیدی مقالات کا انتخاب	۲۰۰۳ء
(۸)	ارمغانِ حبیب	: طرحی نعتیہ مشاعرہ کا پچیس سالہ انتخاب	۲۰۰۵ء
(۹)	اصول نعت گوئی	: تحقیقی وتنقیدی مقالات	۲۰۰۹ء
(۱۰)	معین الدین ماجد	: شخصیت اور شاعری (مع انتخاب کلام)	۲۰۰۹ء

منتظرِ اشاعت کتابیں

(۱) حاذق انصاری: فن اور شخصیت

(۲) قیامت صغریٰ (داستان کربلا)